رچرڈ ڈاکنس کی کتاب

God Delusion

خدا کا دھوکا

کا فلسفیانہ اور سائنسی تجزیہ

مصنف: ڈاکٹر عمر فاروق سعید

ترجمہ: رضی الدین سید۔ کراچی

۰۳۳۱_۲۶۴۶۱۰۹

یہ کتاب انگریزی میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں

پہلی بار مارچ ۲۰۲۱ء میں شائع ہوئی تھی

دوسرا پروف

انتساب

شیخ احمد دیدات

وہ شخصیت جنہوں نے میری زندگی تبدیل کی۔

نوٹ مترجم:......اگرچہ کتاب بہت عمدہ مواد پیش کرتی ہے، لیکن ہر مقام پر مترجم کا مصنف سے اتفاق رائے ضروری نہیں ہے۔

رضی الدین سید
۰۳۳۱_۲۶۴۶۱۰۹

فہرست عنوانات

تعارف

اعتراف

اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ اور درود و سلام اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر!

اپنے اس تحقیقی کام کی تکمیل پر میں اللہ رب العزت کا شکر گزار ہوں، جس کی بے پایاں رحمتوں کے بغیر اس کا سرانجام پانا ناممکن تھا۔

اسی کے ساتھ میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا بھی نہیں بھولوں گا، میرے پورے پیشہ وارانہ دور میں جن کے مکمل تعاون کی وجہ سے ہی میں ایک بہتر اور سخت محنت والا شخص بن سکا۔ طبی (میڈیکل) شعبے سے دینی شعبے کی طرف مجھے متوجہ کرنا، مجھ پر ان کے بڑے احسانات میں سے ایک احسان بن کر سامنے آیا ہے۔ نیز میں اپنے پروفیسرز کا بھی شکر گزار ہوں، خصوصاً نگران پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم رانا صاحب کا، جو زیرِ نظر اس تحقیقی کام کے نقطہ نظر میں بڑی تبدیلی کا سبب بنے۔ ان کے تعاون اور ہمت افزائی نے میرے کام کی جلد تکمیل میں مدد دی۔ اپنی شکر گزاری، میں میڈم فرح کے نام بھی معنون کرتا ہوں، جنہوں نے میرے اس مقالے کی ترتیب و تدوین کے انداز پر عمدہ رہنمائی فرمائی اور اسے ایک مفید مقالے میں تبدیل کرنے کی طرف راغب کیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے ہم جماعت دوستوں عثمان، ناصر، حسنین مصطفیٰ اور عزیز ترین عاکف بھائی کے شکریئے کے بغیر گزر جاؤں جن کے ساتھ نشست و برخاست نے مجھے یونیورسٹی میں بہت لطف فراہم کیا۔ اپنی شکر گزاری میں پروفیسر ڈاکٹر ممتاز الحسن باروی، ڈاکٹر شبیر احمد جامی اور ڈاکٹر حرمین روبورغ (Roborgh) کو بھی شریک کرتا ہوں، جن کے دروس میرے لیے فرحت اور تحصیل علم کا بڑا ذریعہ

بنے۔ یہ تمام صاحبان مجھے کلاس میں بہت عزت دیتے رہے، اپنے قریب کی پہلی صف میں بٹھاتے رہے، حتیٰ کہ کبھی کبھی مجھے اپنے قریب بھی بٹھاتے رہے۔ میرے لیے ان کی جانب سے یہ بڑا اعزاز تھا۔

میرے کبھی نہ ختم ہونے والے سوالات پر ان کی باتحمل خاموشی، اور تحقیق کی خاطر سیشن کے اختتام تک نئے اور چیلنجنگ موضوعات کی فراہمی، ان کی جانب سے میرے لیے زیادہ بامعنی رہی۔ اسی طرح ایک بڑا شکریہ ایڈمن کے برادر ذکاء کے لیے بھی واجب ہے، جن کے تعاون و مدد کے بغیر یہ پورا تصنیفی دورانیہ کافی مشکل ہو جاتا۔

میرے پاس ان سب ہی کے لیے شکر گزارانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس دنیا اور اس کے بعد آنے والی دنیا میں بہترین اجر سے نوازے۔ آمین

عمر فاروق سعید

حرفِ آغاز

اللہ رب العزت کا بے حد شکر گذار ہوں کہ زیر بحث مکالے کی تکمیل پر مجھے حوصلہ افزا کلمات سننے کو ملے۔ چناں چہ اسی حوصلہ افزائی اور مشورے کے نتیجے میں طے ہوا کہ اسے کتابی شکل میں بھی لایا جائے۔ یہ سوال مجھ سے بار بار کیا جاتا رہا کہ جب کسی اور نے اس موضوع پر کوئی کوشش نہیں کی ہے، تو صرف مجھے ہی اس کی طرف راغب ہونے کا خیال کیوں آیا؟

اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اپنے کورس کے آغاز ہی سے میں نے اس پر کتاب مکمل کرنے کا ذہن بنالیا تھا۔ رچرڈ ڈاکنس کی کتاب پہلی دفعہ پڑھنے کے بعد ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کا تجزیہ ضرور کروں گا۔ کتاب کے مطالعے سے بہت سے سوالات میرے ذہن میں جنم لینے لگے تھے، اس لیے میں نے اس موضوع کو ایک کتاب کی شکل میں ڈھالنا ناگزیر سمجھا۔ ذہن میں تھا کہ اگر اس کے متعلق سوالات میرے ذہن میں اٹھ رہے ہیں تو بالیقین دوسروں کے ذہنوں میں بھی اٹھتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس خاص موضوع پر کام کرنے کا خیال آیا۔ اور امید ہے کہ اپنے اس تجزیے سے میں نے انصاف سے بھی کام لیا ہوگا۔

کتاب کا آغاز کرنے سے پہلے قاری کو چند ضروری نکات کو اپنے ذہن میں ضرور بٹھانا ہوں گے۔

❁...... اپنی کتاب کی طباعت کے دوران اصل کتاب (مآخذ) کی ترتیب میں مَیں نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔

❁...... ہائرایجوکیشن کمیشن آف پاکستان (HEC) کے ڈیزائن کی روشنی میں ایم فل کا طالب علم/طالبہ، مقالے کے صرف چار ابواب رکھ سکتا ہے۔ چناں چہ

میں نے بھی اسے چار ابواب ہی تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔

❁...... مخصوص ترتیبی انداز کے پیش نظر مجھے اس کتاب کو مختص کردہ الفاظ اور صفحات ہی تک محدود رکھنا تھا، اسی لیے میں نے چند اصطلاحات کو متعارف کروایا ہے۔ اگرچہ اس کی وضاحت مختصر ہی سی رکھی ہے، لیکن اگر حالات نے اس کی دوسری اشاعت کا موقعہ دیا تو ان وضاحتوں کو میں مزید وسیع کروں گا۔

❁...... مزید یہ کہ بجائے اس کے میں حوالہ جات کے ڈھیر لگاتا، میں نے اپنے ذاتی تجزیوں کو پیش کرنے کو ترجیح دی ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی کتاب کا مصنف ہوں، محض حوالہ جات نقل کرنے والا نہیں!

❁...... آخری بات یہ کہ میں نے اپنے خیالات کو ممکنہ حد تک سادہ رکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے کہ موضوع کو قاری کے لیے زیادہ مشکل بنانے کے بجائے زیادہ قابل فہم بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پڑھنے والوں کے لیے نیک خواہشات۔ اور ان کی جانب سے تجاویز کا خیر مقدم!

پڑھیں اور خوش رہیں!

دیباچہ

ایک ممتاز برطانوی مصنف Richard Dawkins نے ۲۰۰۶ء میں God Delusions (خدا کا دھوکہ) نامی کتاب لکھی تھی۔ کتاب بنیادی طور پر خدا کے انکار اور نظریہ ارتقاء کے اثبات کے گرد گھومتی ہے۔ چناں چہ اس لحاظ سے یہ کتاب دہریت کا ایک ہیولہ سا ہے۔ اپنی پہلی اشاعت کے بعد سے یہ کتاب دنیا میں طویل عرصے تک ''بیسٹ سیلر'' رہی ہے۔ اس کے بارے رائے دیتے ہوئے

(۱)...... Bakewell کہتا ہے کہ ''کتاب میں نہ کوئی شک ہے اور نہ ہچکچاہٹ! اپنی طاقت کے پورے زور سے ڈاکنس چیختا ہوا آتا ہے اور شعلہ و متنازعہ بیان کے شوقین فرد کی قوت کے ساتھ غلطیوں اور جھوٹے اصولوں کو پھیلاتا چلا جاتا ہے۔

(۲)...... Holt کہتا ہے کہ ڈاکنس کی کتاب کا سب سے کم تشفی بخش حصہ خدا کے وجود کے عمومی و روایتی عقیدے پر اس کا تبصرہ ہے۔ نظریہ حقیقت کے مطابق اپنی فطرت کے لحاظ سے خدا کی موجودگی یقینی ہونی چاہیے کیوں کہ وہ ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے۔ اس لیے ''نہ ہونے'' کی بجائے اس کے ہونے کا امکان زیادہ پایا جاتا ہے۔ ادھر کائناتی نظریے کے لحاظ سے دنیا کا ایک آخری مقصد بھی ہونا چاہیے جو ابدالآباد تک قائم ہے۔ یعنی خدا جیسی کوئی ہستی!

تیسرے نمبر پر ''ڈیزائن نظریہ'' کائنات کی چند اہم خصوصیات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ (مثلاً ایک دانش مند زندگی کے ظہور کی صلاحیت)۔ ان خصوصیات کی بناء پر اس کا ہونا زیادہ ممکن بناتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ کائنات کے بامقصد (تخلیق کنندہ کے) ''نہ ہونے'' کے؟

(۳)...... Flew کے نزدیک کتاب کا تجزیہ اس طرح ہے کہ ان نکتہ چینیوں کو

میں اپنے اس بیان سے مسترد کرتا ہوں کہ ''کتاب پر میرا نام درج ہے، اس لیے اس میں پیش کیے گئے خیالات ہر لحاظ سے میرے ہی ہیں۔''

میں اپنے نام سے ایسی کوئی کتاب لے کر نہیں آؤں گا جس کے مندرجات سے میں سو فیصد متفق نہیں ہوں۔ اس کی خاطر میں ایسے آدمی کو تلاش کروں گا جو میری طرف سے اصل مواد تحریر کرے، کیوں کہ اس وقت میں ۸۴ سال کا ہوں۔ اور یہی کردار Roy Varghee کا تھا۔ یہ خیال کہ بڑی عمر کی وجہ سے میرے خیالات کو کسی نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے بالکل بے بنیاد ہے۔ میں بڑی عمر کا ضرور ہوں، لیکن میرے نظریات پر کسی کا حملہ آور ہونا بھی نہیں ہے۔ یہ کتاب میری ہے اور میرے ہی خیالات و نظریات کو پیش کرتی ہے۔

ڈاکنس ایک معروف دہریہ ہے۔ ستر کی آخری دہائی ہی سے وہ اس قسم کے موضوعات پر لکھ رہا ہے۔ اس نے اپنی پہلی کتاب The Blind Watchmaker لکھی تھی، جس کے بعد اسّی کے وسط میں ایک دوسری کتاب بعنوان The Selfish Gene تصنیف کی تھی۔ بعد ازاں ۲۰۰۶ء میں زیر تبصرہ کتاب The God Delusion لکھی، جو اپنی اصل میں ''بلائنڈ واچ میکر'' اور ''دی سیلفش جین'' کا تسلسل ہی تھی۔

میرا یہ تحقیقاتی مکالمہ بنیادی طور پر ڈاکنس کے پیش کردہ ملحدانہ نظریات اور سائنسی لحاظ سے اس کے گہرے تاریخی اور فلسفیانہ تجزیے کے گرد ہی گھومتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسمیں ڈارون کے نظریے پر بھی گفتگو ہوگی۔ اپنی کتاب کے عنوان کے برعکس ڈاکنس خود ہی کچھ مفروضے طے کرتا ہے اور پھر انہیں براہ راست خدا کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ یہ واہمے خدا نے اسے نہیں بتائے تھے بلکہ ڈاکنس نے خدا پر انہیں خود ڈال دیا ہے، لہٰذا کتاب کا مقصد ہی اس کی کتاب کا تجزیہ اور نظریہ اتفاق (نظریہ

ارتقاء) کا موازنہ کرنا ہے جو ارتقاء کی اصطلاح کے لحاظ سے ایک فلسفیانہ اتفاق ہے نہ کہ حقیقی اتفاق!

دلائل کو فلسفیانہ لحاظ سے جانچنے کا مطلب مفکرانہ طریقہ کار Thought Process Methodology انطباق ہے جس میں علمی دانش کا استعمال بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ کسی کام کے تجزیے کی خاطر سائنسی طریقہ کار کے انطباق کا مطلب سائنسی میدان میں کسی مخصوص دعوے سے متعلق تاہ ترین سائنسی حقائق کو پیش کرنا ہے۔ اس زیر مطالعہ تحقیقی مواد میں دونوں قسم کے طریقہ ہائے کار کو بروئے کار لایا جائے گا تا کہ ڈاکِسن کی کتاب کا ایک تفصیلی مطالعہ سامنے آسکے اور کوئی بھی پہلو نظر انداز نہ ہو سکے۔

مزید برآں میری اس کتاب میں God Delusion کے نام پر کی گئی تمام محنت، اس کتاب سے وابستہ دیگر تحقیقی مضامین، پیٹنٹس اور کتب پر تجزیے پر ابھارنے والے خیالات و مستند حوالہ جات بھی پیش کیے جائیں گے تا کہ اپنے نقطہ نظر کو میں واضح طور پر ثابت کر سکوں۔ اسی طرح دوران تحقیق غیر جانبدارانہ اور بڑے حوالہ جات بھی فراہم کیے جائیں گے۔ مزید، مقبول عام بیانیوں کو بھی شامل کیا جائے گا تا کہ میرے کام کی مستند حیثیت سامنے آسکے۔ ڈاکِنس کی مانند نہیں، جس نے اپنے خیالات کی تقویت کے لیے صرف متنازعہ ترین رایوں اور نا قابل قبول نقطہ ہائے نظر ہی کتاب میں سموئے ہیں۔

مقاصد

۱۔ ارتقا کی جانب بڑھنے والے God Delusion کا ایک ناقدانہ جائزہ پیش کرنا۔

۲۔ God Deluion میں وجودِ خدا اور دہریت کے بارے میں ابھارے گئے سوالات کے جوابات فراہم کرنا۔

۳۔ نظریہ ارتقا کا موازنہ کرنا۔

۴۔ خدا پر ایمان رکھنے سے متعلق اصل فلسفے کو تنقیدی لحاظ سے قید میں لانا۔

۵۔ خدا کے وجود سے متعلق سائنسی حقائق کو تلاش کرنا۔

دلائل عقلی

اس موضوع پر ایک تنقیدی جایزہ دہریت کے زیر بحث لائے گئے گرم موضوع کے لیے ایک ہمہ جہتی پیشکش ہوگی اور الٰہیات کے میدان میں موجود دانش وارانہ تھنک ٹینکس کے بڑے عالمی استفادے کا سبب بھی بنے گا۔ اس کے تحت وجودِ خدا اور ارتقا دونوں ہی نظریات ہی زیر بحث آئیں گے اور دونوں ہی پہلوؤں پر باخبری کا شعور پیدا ہوگا۔

جدید دہریت کے بالکل آغاز ہی سے خدا کے وجود کے بارے میں مباحثے بہت عام ہوئے ہیں، خاص طور پر مغرب میں! کسی کے تحقیقی میدان میں ہونے یا نہ ہونے کے باوجود دانشوارانہ حلقوں میں ''خدا'' سب سے زیادہ بحث شدہ موضوع گردانا گیا ہے۔ جن سے درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لاتعداد لوگ اس امر میں مغالطے میں مبتلا ہیں کہ آیا وجود خدا پر آنکھ بند کر کے اعتقاد کیا جائے یا اعتقاد سے پہلے مزید غور کر لیا جائے۔ چناں چہ ضروری ہے کہ معاشرے کی بہتری کے لیے اس موضوع کو علمی و عقلی دونوں لحاظ سے پرکھا جائے۔

بحیثیت مسلمان اور کئی مذاہب کے وجود کو تسلیم کر لینے والے ہونے کے باعث یہ ہماری بھی ذمے داری بنتی ہے کہ وجود خدا کا عقلی و دانشوارانہ دفاع کیا

جائے تا کہ کسی کو بھی انگلی اٹھانے کا موقعہ نہ ملے کہ اس کا کوئی گوشہ تحقیق کے مرحلے سے گذرے بغیر ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ فریضہ جسے ہمارے نیک نفس پیش رووٴں نے بھی ماضی میں مستشرقین کے خیالات کا عقلی جائزہ لیتے ہوئے انجام دیا اور خدا کے واقعی وجود پر علمی و عقلی لحاظ سے مستقل کتابیں تصنیف کر کے انہیں با قاعدہ جواب دیا ہے۔ اس لیے اب ہماری بھی ذمے داری بنتی ہے کہ جدید دنیا میں ان کے نقش قدم کی اتباع کریں جہاں اس کام کی فی الواقع ضرورت زیادہ ہے۔

شیخ ابوبکر بن خلاّن کے مطابق فقہ کے چوتھے امام حضرت احمد بن حنبلؒ نے ایک دہریئے کے جواب میں فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان کے عرش پر اپنی مخلوق سے بالکل جدا، الگ اور ممتاز بیٹھا ہے جب کہ اس کی طاقت اور علم ہر جگہ پر محیط ہے۔

ایک دانشور Damon Linker موضوع کو سمیٹتے ہوئے لکھتا ہے کہ مشرق و مغرب دونوں کی مابعد الطبیعات روایات کے مطابق خدا، حقیقت کا غیر مشروط سبب ہے۔ ہر چیز کا حتمی سبب ہے، ابتدا سے اختتام کائنات تک! اس طریقے سے سمجھنے والے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ خدا کا وجود ان معنوں میں ہے، جیسا کہ ماؤنٹ ایورسٹ اور الیکٹرونس موجود ہیں۔ خدا پایا جاتا ہے اور ایسا ہر اتفاق چیز کے وجود ہی سے ثابت ہے، اس کے امکانات کو واضح کرتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے، اکائی ہے، اور حقیقت کا روپ دیتا ہے۔

ایک دہریہ بلاگر Jerry Coyne بیان کرتا ہے کہ God Delusion میں رچرڈ ڈاکِنس نے اپنے ہی کہنے کے مطابق خدا کے مفروضے کو بڑی مہارت سے منہدم کیا ہے، مگر اس کی تقویت کے لیے کہ اس مفروضے نے پوری تاریخ میں مذہبی عقیدے کی تشریح کی ہے، یا آج کی دنیا میں تشریح کرتا ہے، وہ محض چند سرسری

واقعات ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔

AC Grayling زور دیتا ہے کہ دہریئے حضرات مذہب کو پڑھنے سے فی الحقیقت دور ہی ہیں، کیوں کہ پھر انہیں خدا کے ماننے والے بعض علمی لوگوں سے واسطہ پڑنے لگے گا جب کہ دہریت مذہب کی حدود کو مسترد کرتی ہے۔ گزشتہ سال ''دی اٹلانٹک'' ایک تحریر بعنوان ''مذہب کا مطالعہ'' گردش میں لے کر آیا تھا۔ ''باوجود اس کے کہ آپ خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہوں۔'' (مصنف نے کتاب میں The Atlantic کی وضاحت نہیں کی۔ شاید اس سے کسی اخبار کا نام مراد ہو۔ مترجم)

اس لیے یہ بات ہمیں بہت جوش کے ساتھ اس نکتے پر پہنچاتی ہے کہ اس موضوع کو ضرور زیر بحث لائیں اور اس پر تحقیقی مواد بھی مہیا کریں، تا کہ دانشورانہ دنیا میں کچھ نیا اضافہ کیا جا سکے اور خدا کے وجود پر تذبذب کا شکار ہونے والوں کو ان کے شک و تذبذب سے نکالنے میں مدد کی جائے۔

American Athiest Society اپنے مقاصد کے فروغ اور وجود خدا پر شک پیدا کرنے کے لیے بہت جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لوگوں کو اس بات کے لیے کھڑا کیا جانا چاہیے کہ خدا پر ایمان نہ رکھنے سے متعلق سوالات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ سائنسی طریقہ کار کو استعمال کرتی ہے۔ اس لیے بھی اس ضمن میں ایسی معقول تحقیقی تحریروں کی ضرورت ناگزیر ہے، جو انکار خدا کی تحریروں کی بالکل ہم پلہ ہوں۔

مفروضے

۱۔ خدا ایک واہمہ نہیں بلکہ حتمی سچائی ہے۔

۲۔ خدا کوئی حقیقت نہیں بلکہ افسانہ اور مغالطہ ہے۔

تحریروں کا جائزہ

مذکورہ موضوع سے متعلق متعلقہ لٹریچر کی تفصیل اور گہری تلاش کے بعد اندازہ ہوا کہ اس معیار کا کوئی کام اب تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ البتہ کچھ مضامین ضرور پائے جاتے ہیں، جو یا تو دینی موضوعات پر ہیں یا کچھ دیگر ''سائنسی و دینی تعلیمات'' کو سمیٹے ہوئے۔ اس کے علاوہ الٰہیات اور دہریت کے موضوعات پر چند مستند کتابیں بھی ملتی ہیں۔ لہٰذا ذیل میں اس سے متعلقہ بہت موزوں و متعلقہ لٹریچر کی ایک تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

۱۔ Nidhal G(۴) نے بیان کیا کہ اسلامی مذہبی مفکرین کا حتمی نقطہ نظر، تصور ارتقا کی واضح تردید کرتا ہے، جب کہ ان میں سے بعض لوگ جنھوں نے اس تصور کو درست قرار دی ہے، مذہبی نہیں بلکہ فلسفی ہیں۔

۲۔ Danied H(۵) نے بیان کیا کہ ''چمپنزی انسان'' کے کروموسومز اس قدر منفرد مشابہت رکھتے ہیں کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے آباواجداد ایک ہی تھے۔

۳۔ ڈینیئل (۶) کا کہنا ہے کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا ایک علمی نظریئے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، لہٰذا محض کسی نظریئے کی بنا پر ہمیں اپنے عقائد کی بنیاد نہیں رکھنی چاہیے۔

۴۔ یحییٰ (۷) بیان کرتا ہے کہ ''ڈارونیئیت محض غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ انسان، مچھلی، یا بندر کی جینیات اپنی خصوصیات کی بنا پر ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ انسان میں موجود AG اور AC حصے، انسانوں کی تخلیق کرتے ہیں جب کہ بندروں میں موجود یہی حصے خود بندروں کی خصوصیات کو جنم دیتے ہیں۔

۵۔ کولنیس (۸) نے اظہار کیا ہے کہ مجھ پر یہ بھی واضح ہوا کہ قدرتی (حیاتیاتی) دنیا کے اسرار کو عیاں کرنے کی غیر متنازعہ قوت رکھنے کے باوجود، سائنس خدا کے مسئلے کو

حل کرنے میں میری مزید مدد نہیں کرسکتی۔ اگر کوئی خدا ہے تو اسے (موجودہ) حیاتیاتی دنیا سے باہر ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے اس بارے میں جاننے کے لیے سائنسی امور درست راستہ نہیں ہیں۔

۶۔ بل اور جیمر (۹) کا کہنا ہے کہ اپنی کارکردگی کے لحاظ سے حتمی تخلیقی عمل کا ذمے دار، محض خدا ہی ہے۔

۷۔ یحییٰ (۱۰) نے واضح کیا کہ ''انسانی تخلیق'' اس کی حد درجہ اکملیت اور کسی بھی غلطی سے اس کے برأت محض کسی حادثاتی وجود سے ممکن نہیں ہے۔ اسے درحقیقت تمام اختیارات کی مالک ہستی کا معجزہ کہنے کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔

۸۔ یحییٰ (۱۱) نے مزید واضح کیا کہ انسانیت سے دور رکھ کر خدا کے تصور کو دیکھنے کے لحاظ سے ڈارونیئیت نے دنیا میں بربادی کے طوفان ہی کو راہ دی ہے اور بدلے میں اس تباہ کن صورت حال کے خاتمے کے لیے کچھ بھی مہیا نہیں کیا۔

۹۔ Crean(۱۲) کہتا ہے کہ خدا ہرگز بھی کوئی واہمہ نہیں، بلکہ ایک ٹھوس سچائی ہے۔ ڈاکنس کے پیش کردہ نظریات کو عیسائی اخلاقیات نے سختی سے مسترد کیا ہے۔ ہم خدا پر مکمل ایمان رکھتے ہیں باوجود اس کے کہ اس کے وجود پر اعتراضات پیش کیے جاتے رہیں۔

۱۰۔ یحییٰ (۱۳) نے مزید اظہار کیا کہ یہ کتاب ارتقا کے واہمے پر ایک (ہمہ وقت دستیاب) جیسی کتاب ہے۔ ڈاکیسن کے پیش کردہ خدا کے واہمے والے نظریئے کو مسترد کرنا دراصل خود ارتقا کے نظریئے کو مسترد کرنا ہے۔

۱۱۔ یحییٰ (۱۴) کا یہ بھی کہنا ہے کہ عقل و دانش کی بنیاد پر خدا پر ایمان رکھنا ہرگز بھی بے وقوفی نہیں ہے، کیوں کہ عقل و فہم ہی خدا کی جانب رہنمائی کرتے ہیں،

جہاں کہیں بھی آپ جاتے ہیں۔ اللہ وہیں اپنی نشانیاں ظاہر کرنے لگتا ہے، لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ نشانیاں تو بالکل درست ہوں، لیکن انہیں عیاں کرنے والا درست نہ ہو؟

۱۲۔یحییٰ (۱۵) مزید اضافہ کرتے ہیں کہ جدید دور کے مغربی معاشرے میں پائی جانے والی یہ غلطی، عقیدے کے غیر حقیقت پسندانہ تفہیم کے باعث ہی ممکن ہوئی ہے۔ اعداد و شمار اور حقائق ثبوت دیتے ہیں کہ یہ معاشرہ ہی ہوتا ہے جو ایک مخصوص ذہنیت کو لے کر چلتا ہے، جب کہ نظریہ اپنی جگہ پر مضبوط قائم رہتا ہے۔

۱۳۔یحییٰ (۱۶) نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ لوگ بے شک منکرین خدا ہیں، لیکن اس سوال کا جواب دینے سے یکسر قاصر ہیں کہ دنیا وجود میں کیسے آ گئی؟ ان کی باتیں سب کی سب محض مفروضہ اور قیاس آرائیاں ہیں۔ یہ کہ ''انسان، چمپینزی بندروں میں محض حادثاتی طور پر سے برآمد ہوئے ہیں'' ہرگز بھی حقیقت نہیں ہے۔

۱۴۔۱۷(Tzortzis) کا کہنا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق خدا نے ایک بڑے مقصد کے لیے کی ہے۔ یہ کہ ہر ذی نفس کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے۔ (یعنی) ان کے ساتھ ناانصافی ہرگز بھی نہیں کی جائے گی۔

۱۵۔Sarfati۱۸)) نے اسے اس طرح بیان کیا کہ ارتقا ایک افسانہ ہے اور ہماری بہترین صلاحیتیں بھی اسے ہرگز حقیقت میں تبدیل نہیں کر سکتیں۔ چناں چہ اسی موقعہ پر تسلیم کیا جانا ضروری ہے کہ خدا ہی خالق ہے اور ہم سب اس کی مخلوق ہیں۔

تحقیقی خلا

دہریئت کے موضوع پر بین الاقومی طور پر بے شمار تصنیفی کام کیے گئے ہیں، اس کے باوجود رچرڈ ڈاکنس کے کام کی اپنی ہی ایک انفرادیت ہے۔ خدا کے عدم وجود

کے ثبوت کے سلسلے میں اس نے بہت سارے زاویوں سے محنت کی ہے۔ اس نے مقدور بھر کوشش کی ہے ہے اس موضوع پر کوئی اور اس کا ہمسر نہ ہو۔

تحقیقی سوالات

۱۔کیا ڈاکنس نے خدا کی تصویر اور خیال کو اصل صورت حال میں پیش کیا ہے؟

۲۔کیا واہمہ خلا پر اس کے نظریات آیا وہی ہیں جو اس کے ہم عصر فلاسفروں اور سائنسدانوں نے پیش کیے تھے؟

۳۔کیا الٰہیات کے موضوع پر ڈاکنس کے خیالات بہت ہی جامد ہیں جو اس کے تصور ارتقا کو سہارا دیتے ہیں۔

۴۔کیا ارتقا کا عمل انسانوں میں فی الحقیقت کام کرتا ہے اور یہ کہ خدا پر اعتقاد کیا ایک غیر عقلی بات ہے؟

۵۔کیا جدید فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں بھی دہریئت کا نظریہ اپنے اندر کچھ وزن رکھتا ہے؟

تحقیقی طریقہ کار

۱۔تحقیق میں مفصل اور تجزیاتی تحقیقی طریقہ کار کو اختیار کیا جائے گا۔

۲۔محقق کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے وہ پورا پس منظر تفصیل سے بیان کرے اور پھر کہیں جا کر اس کا تجزیہ سامنے لائے۔

۳۔محقق کے لیے لازم ہے کہ وہ ''لائبریری محققانہ طریق کار'' کی اتباع کرے، اصل ماٰخذ کا گہرا مطالعہ کرے اور پھر تمام کام کا تجزیہ کرے۔

۴۔محقق پر لازم ہے کہ وہ کتابوں، انٹرنیٹ اور جدید ٹیکنالوجی کے تمام مستند ذرائع بروئے کار لائے۔

تحدیدات (حدود)

۱۔ محقق اپنے تجزیاتی کام کو محض ڈاکِنس کے پیش کردہ ''واہمۂ خدا'' کے خیالات ہی تک محدود رکھے گا۔

۲۔ تحقیق نگار کو محض متعلقہ عنوانات ہی تک محدود رہنا ہوگا۔

مقالے کے لیے مجوزہ ابواب

باب ۱: خدا کا وجود، اس کی تاریخ، مختلف مذاہب میں خدا پر ایمان۔

باب ۲: رچرڈ ڈاکِنس کے واہمہ خدا کا تعارف، اس کے فلسفیانہ و سائنسی نکات، کتاب میں موجود تضادات۔

باب ۳: ارتقا اور اس کی تاریخ، ارتقا کے بارے میں ڈاکِنس کے دعووں کا جواب، اس کی حقیقت، ڈارون کا نظریہ اور اس کی خامیاں۔

باب ۴: وجود خدا کی سائنسی و فلسفیانہ، عقلی توجیہہ، دہریت اور خدائی پر عقلی نقطہ نظر، واہمہ پر رچرڈ ڈاکینس کے پیش کردہ تمام خیالات کو مجتمع کرنا اور تجزیہ کرنا۔

خاتمہ

ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ رچرڈ ڈاکنس کا ''نظریہ واہمہ خدا'' خدا کے وجود کے بارے میں حالات کی شہادتیں پیش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ثبوت کی خاطر اس نے محض ایک نظریاتی راستہ اپنایا ہے۔ اس کے کام کا بیشتر حصہ فلسفے اور سائنس کے گرد گھومتا ہے، جب کہ یونانی، جدید فلسفے اور جدید سائنس نے اس کے خیالات کو غیر حقیقی ثابت کیا ہے۔ اس لحاظ سے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ خدا کوئی دھوکا نہیں بلکہ ایک حتمی حقیقت ہے۔

حوالہ جات

1. Bakewell, J. (2014), Belief in God, 218, 17-21.
2. Holt, J. (2013), Beyond Belief, 88,19-28.
Flew, A. (2010), There is a God: How the World's Most Notorious Atheist Changed his mind. 3,36-54.
3. Guessoum, N. (2018) Oxford University Press, 250, 117-139
4. Haqiqatjou, D. (2017), The Yaqeen Magazine, 17,2-18
5. Varisco, D. (2010), Social Authropology, 73,91-102
6. Yahya, H. (2003) Darwinism Refuted, (2nd Edition) Goodreads, India, P.23
7.Francies S. Collins The Language of God, P.30
8. Bill Masler-H. James Cleaves II, A Brief History of Creation P.53
9. Yahya, H. (2003), The Miracle of Human Creation, Goodreads India, P.17
10. Yahya, H. (2003), The Disaster Darwinism Brought to Humanity, Goodreads India, P.
11. Crean, T.(ND) God is No Delusion, Marathon, UK, P.160
12. Yahya, H. (2003), Evolution Deceit, Goodreads India, P.89
13. Yahya, H. (2003), Allah is Known Through Reason, Goodreads India, P.110
14. Yahya, H. (2003), Crude Understanding of of Disbelief, Goodreads India, P.111
15. Yhaya, H. (2003), The Nightmare of Disbelief, Goodreads India, P.69
16. Tzortzis, H.A (2017) The Divine Reality, WS, USA, P.7
17. Sarfati, J. (2008), Refuting Evolution, Wellington, NZ, 2008, P.50

تعارف

خدا کے وجود کے بارے میں جاننے کی طلب کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نسل انسانی کے عین آغاز ہی سے انسان، اس کی تخلیق (انسان) اور نسبتاً بڑے پیمانے پر تخلیق کائنات کے بارے میں حیرانی کا بھی شکار رہا ہے اور اس کی جستجو میں سرگرم بھی رہا ہے نتیجے میں تخلیق کے بارے میں کئی نظریات، مفروضے اور تصوررات سامنے آتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں دو معروف نظریئے سامنے آئے ہیں جن میں سے ایک Semitic نظریہ تھا اور دوئم Vadanta نظریہ تھا، جو بالترتیب وحدانی اور کثرت کی نمائندگی کرتے تھے۔ لیکن اس کے متوازی ایک اور فکر بھی تھی جو ابتدا ہی سے وجودِ خدا سے انکاری تھی۔ اور یہی فکر پھر دہریت کہلائی۔

دہریت کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ چوں کہ خدا کو دیکھا نہیں جاسکتا، اس لیے یہ محض ایک اتفاقی چیز ہے۔ کیوں کہ سیمیٹک (وحدانیت) والے مذاہب ایک اَن دیکھے خدا پر یقین رکھتے ہیں، جب کہ کثرتِ خیالات والے بھی بتوں کے نام پر کسی اَن دیکھی قوت پر یقین رکھتے ہیں۔ تاہم دونوں مکتبہ فکر کے خالات کے مثبت و منفی بحثوں سے بچتے ہوئے دہریوں نے انسانی معلوم تاریخ کے پورے دور میں، جس کا دورانیہ صدیوں پر محیط ہے، خدا کے انکار ہی پر اصرار کیا ہے۔ ان ادوار کو تین حاوی مدتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولین و بنیادی دور بت پرستی ہے۔ قدیم یونان، جس کے بانی اور وہمی تھے۔ اس کے ردِعمل میں وسط مدتی دور آیا جب Semitic مذاہب ابھرے۔ یہ دور بہت زیادہ حاوی و جاری رہا۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام، تینوں مذاہب ایک دوسرے کے سامنے آتے رہے۔ جب کہ جدید ترین دور نے الہامیات اور مذہبیات پر ایک بالکل نیا رخ لیا جس کا زور یہ تھا کہ خدا کے وجود پر عقل و دانش

کے ساتھ غور و فکر کیا جانا چاہیے۔ اس انداز نے دہریت کے کئی تھنک ٹینکس کو جنم دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

رچرڈ ڈاکنس، معروف انگریز ماہر حیاتیات نے ۲۰۰۶ء میں The God Delusion نامی ایک کتاب لکھی، جس کا بنیادی نقطہ نظر خدا کے وجود کا انکار اور اس کے وجود کے بارے میں موجود دلائل کی تردید ہے۔ اپنی پہلی اشاعت کے بعد ہی سے اس کتاب نے حد سے زیادہ شہرت حاصل کی اور عالمی ''بیسٹ سیلر'' کا اعزاز حاصل کیا۔ اس موضوع پر ڈاکنس کی یہ پہلی کتاب نہیں تھی بلکہ گزشتہ چار عشروں سے وہ اس کے کیے جانے والے کاموں کا ایک تسلسل تھی۔ اس کے کیے گئے گزشتہ کام حسب ذیل تھے۔

1- The Selfish Gene (1976)
2- The Extended Phenotype (1982)
3- The Blind Watchmaker (1986)
4- River Out of Eden (1995)
5- Climbing Mount Improbable (1996)
6- Unweaving the Rainbow (1998)
7- A Devil's Caliph (2003)
8- The Ancestor's Tale (2004)
9- The God Delusion (2006)

اس لحاظ سے اس کی یہ آخری کتاب، پچھلی تمام کتابوں کا خلاصہ ہے اور اسی وجہ سے اسے یہاں تجزیئے اور تبصرے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

ڈاکنس کی دانشورانہ صلاحیتوں پر کوئی تبصرہ کیے بغیر (جب کہ Prospect Magazine میں اسے دنیا کے تین عظیم ترین دانشوروں Umberto Eco اور

نوم چومنسکی کے ساتھ رکھا گیا ہے) ہمارے لیے یہ بات گہری توجہ اور اہمیت کی ہے کہ عین بین الاقوامی تحقیقی طریقہ کار کی روشنی میں اس کے کام کا جائزہ لیا جائے۔ لہٰذا خاص اسی مقصد کے لیے اس کتاب کا انتخاب کیا گیا ہے۔

تجزیہ جاتی طریقہ کار کی اصطلاح کی روشنی میں The God Delusion کے اصل اور بنیادی حصے دو ہیں۔ جب کہ یہ کتاب اس کے سابقہ کاموں کا نچوڑ ہے۔ اس لیے اختیار کیا گیا پہلا طریقہ سائنسی ہے۔ ڈاکنس چوں کہ ایک ماہر حیاتیات Biologist تھا، اس لیے بنیادی طور پر ابتدا میں اس کے علمی کام، خدائی موضوعات کے سائنسی تجزیے پر مشتمل تھے۔

طریقہ کار سے اتفاق یا اختلاف کے باوجود یہی طریق کار اس کی اس کتاب کے تجزیے کے لیے بھی اختیار کیا جائے گا۔ اس سے تبصرے کے غیر متنازعہ ہونے کا تاثر بھی ابھرے گا۔ دوئم، وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکنس نے ایک فلسفی کی حیثیت بھی اختیار کر لی ہے۔ چناں چہ بعد کے سالوں میں تحریر کردہ اس کی کتابوں میں فلسفیانہ موشگافیاں بھی نظر آتی ہیں۔ کتاب The God Delusion میں اس کی یہ دونوں حیثیتیں مل کر سامنے آتی ہیں۔ چناں چہ کتاب کا تحلیل و تجزیہ کرتے وقت پھر فلاسفرانہ طریقہ کار کو بھی استعمال کیا جائے گا۔ یہ طریقہ ڈاکنس کے دلائل کی روشنی کے پس منظر میں واضح طور پر دکھائی دے گا۔ اپنے نقطہ نظر کے اثبات میں اس نے ایک طرف سائنسی معلومات لی ہیں اور دوسری طرف فلسفیانہ دلائل دیے ہیں۔

اس کے نتیجے میں زیر نظر جائزہ جاتی کام اختیا کیا گیا، جس کا نام Philosplical and Scientific Analysis of Richard Dawkins رکھا گیا۔

محقق کی کوشش ہے کہ زیر تبصرہ کتاب میں پیش کیے گئے دعوؤں پر بلا روک ٹوک ثبوت سامنے رکھے جائیں۔ موضوع کی اہمیت چوں کہ واضح ہے، نیز ایم فل کی سطح پر زیر بحث کتاب کا کسی اور نے تبصرہ جاتی جائزہ بھی نہیں لیا ہے تو اللہ نے چاہا تو دوسرے نقطہ نظر سے یہ ایک بالکل اولین کام شمار کیا جائے گا۔

اپنے امور میں ہم اللہ تعالیٰ ہی کی استعانت طلب کرتے ہیں۔

باب اول

خدا کا تعارف

واحد خدا کے تصوراتی مذاہب میں خدا کو اعلیٰ ترین، خالق اور تمام عقائد کی اصل قرار دیا جاتا ہے۔ خدا کا مطلب ہر چیز کا جاننے والا، ہر بات کی قدرت رکھنے والا، ہر جگہ پایا جانے والا اور ابدی و لازمی وجود رکھنے والا ہے۔(۱)

مختلف عقائد اور مذاہب میں خدا کا تصور الگ الگ ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ ایک باقاعدہ ہستی ہے اور کچھ کے نزدیک یہ محض فلسفیانہ بات ہے۔ بدھ مت کی مانند خدا کا تصور بہت واضح نہیں ہے۔ اس لیے اسے ایک ''لا ادری'' (خدا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں) والا مذہب جانا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے مذاہب مثلاً ہندومت میں کسی ایک واضح خدا کا تصور نہیں ابھرتا۔ اسی لیے وہاں مختلف قسم کے خداؤں کے پرستش کی جاتی ہے، حتیٰ کہ جانوروں تک کی! (گائے کا پوجا جانا وہاں ایک عام بات ہے۔ مترجم) لیکن Semitic (ابراہیمی) مذاہب میں خدا کے لیے ایک واحد تصور اور دوٹوک نظریہ موجود پایا جاتا ہے جہاں واحد اور ایک خدا، سب کچھ جاننے والا، ساری قدرت رکھنے والا، خالق، قائم رہنے والا اور تمام چیزوں کو ختم کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ تینوں ابراہیمی عقائد (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) میں بہت واضح ہے۔ جو خدائی صفات کی ایک مکمل تشریح اور خدائی فرائض و وجود کی واضح تاریخ پیش کرتے ہیں۔ اس کے فرائض میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کے وجود کا اقرار دل کے مکمل اعتماد کے ساتھ کیا جائے۔ اس کے برعکس خدا کے بارے میں چند فلسفے، جن میں سے چند باقاعدہ مذہب کا درجہ اختیار کر گئے اور چند فلسفے ہی

بنے رہے، خدا کے وجود کے بارے میں محض ایک اندازہ سامنے لاتے رہے، بجائے اس کے کہ کوئی دلائل بھی لاتے۔

اس باب میں ہم مختلف مذاہب میں وجودِ خدا، تاریخِ خدا اور عقیدہ کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ وجودِ خدا کو ہم ایک فیصلہ کن حقیقت کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟ زمانہ ماضی کے مفکرین خدا کے بارے میں کیا کچھ کہتے رہے ہیں؟ انسانیت نے خدا پر اعتقاد رکھنے کا آغاز کیسے کیا۔ خدا کی اپنی تاریخ کیا ہے؟ مختلف عقائد و فلسفوں میں خدا پر عقیدے کا کیا رنگ ہے؟ ماضی کے دانشور و مفکر اس موضوع پر کیا بیان کرتے رہے ہیں؟ یہ سوال اور ان کے ساتھ خدا سے متعلق تمام دیگر صورت حال بھی واضح کی جائے گی۔ آئندہ کے ابواب میں جدید فلسفوں اور سائنسی معلومات کی روشنی میں وجودِ خدا کے نظریئے کی حمایت اور مخالفت میں دیے گئے دونوں مفکرین کے نقطہ نظر کا باریکی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ مذکورہ باب کے اختتام پر حاصل شدہ مواد کا ایک نتیجہ برآمد کیا جائے اور متوقع دعویٰ پیش کیا جائے گا۔ باب میں اس سے قبل نتیجہ نکالے گئے مواد کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ سفارشات بھی واضح کی جائیں گی۔

۱.۲۔ خدا پر ایمان

نسلِ انسانی کی بالکل ابتدا ہی سے انسانوں نے ایک غیر معمولی و مافوق الفطرت عظیم ہستی کا تصور ذہنوں میں موجود رکھا ہے جو ان کے امور سرانجام دیتی ہے۔ اس ہستی کا عقیدہ انسانی فطرت میں اس طرح گندھا بسا ہے کہ جب بھی کوئی شخص خود کو کسی مصیبت میں پاتا ہے تو فوراً ہی آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر مدد کا طالب ہوتا ہے۔ یا جب بھی کسی اندھیرے میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنی کھلی ہوئی دونوں ہتھیلیوں کو باہم جوڑ کر

اوپر اٹھاتا اور خدا کی مدد کا طالب ہونے لگتا ہے۔ یہ انسانی فطرت، اس کی خصوصیت اور خاصہ ہے۔ یہ خصوصیات بالکل واضح ہیں اور اسی ڈی این اے کا حصہ ہیں جس میں ہر فرد کی تمام معلومات موجود ہیں۔ بالکل کمپیوٹر کی ثنائی Binary کی مانند، جہاں تمام اطلاعات موجود ہوتی ہیں۔ انسانی ڈی این میں ان تمام Binaries کو Gene کہا جاتا ہے۔ تو اس موقع پر سوال اٹھتا ہے کہ یہ انسانی جین خدا کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

تازہ ترین سائنسی تحقیق نے ایک نئی جین بنام "God Gene" دریافت کی ہے۔ تحقیق کے مطابق انسانی جسم کے اندر جہاں اور دیگر قسم کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں، وہیں ایک مخصوص خاصیت خدا پر اعتقاد کے بارے میں بھی موجود ہے۔ اس کا نام سائنسدانوں نے Vasciular Monomine Transporter (VMAT2) جین رکھا ہے، جس کا بنیادی کام ہی انسانی جسم کے اندر خدا پر اعتماد کا خاصہ جنم دینا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک روحانی جین ہے جو بنائی ہی الہامی طور پر اس لیے گئی ہے کہ ہر انسان میں وہ خدا پر اعتقاد کا نفوذ کرے۔ اس سے دور ہونا یا خدا پر اعتقاد کے خلاف عمل کرنا ایسا ہے، جیسے انسان اپنی بنیادی جین اور فطرت کے خلاف کام کرے۔

ایک ترقی پذیر ذہنیت میں داخلے کے لیے کسی کو اپنے پرانے اعتقادات کو غلط ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ کہ وہ اپنی بنیادی انسانی فطرت کو مضبوطی سے پکڑے اور پھر عالم جدید میں تنقیدی سوچ کو ایک نئے پہلو کی طرف لے جائے۔ مساوی مسائل کا آخری حل پانے کی خاطر بس یہی ایک راستہ موجود ہے، جس کے بعد رہائش کی خاطر دنیا ایک بہتر عقلی و دانشمندانہ جگہ بن سکتی ہے۔ ہر قسم کے تنازعے اور

اختلاف رائے میں اصل زور اس پر دینا چاہیے کہ نفرت سے دور رہا جائے، نہ یہ کہ ہر معاملے میں ایک منصف کی طرح دوٹوک رائے دے دی جائے۔

طرزِ فکر خواہ سائنسی ہو یا فلسفیانہ، گہرے جائزے اور وسیع تجربوں کی بنیاد پر، بنیادی اصول اور طریقہ ہائے کار پہلے سے طے اور تیار شدہ ہیں۔ کسی بھی نظریئے یا صورتِ حال کو قبول یا مسترد کرنے کی خاطر اگر ایک مناسب طریقہ کار سامنے لایا جاتا ہے، تو اس طریقہ کار کے خلاف چلنا سوائے تعصب اور تنگ نظری کے کچھ نہیں ہے۔ جب معاملہ خدا کا ہو، تو سوال زیر بحث یہ آتا ہے کہ آیا خدا ایک مفروضہ ہے یا اٹل حقیقت؟ مذہبی نقطہ نظر یا طریقہ کار کے لحاظ سے خدا کا وجود ایک اثبات ہے جب کہ سائنسی طریقہ کار کے لحاظ سے یہ ایک نظریہ ہے۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں توازن کی تلاش کرتے ہوئے مشترکات کو کارفرما ہونا چاہیے۔

۱.۳۔ مختلف مذاہب اور فلسفوں میں خدا کا عقیدہ

اپنے بالکل قدیم فلسفوں سے لے کر آج کے تازہ ترین مذاہب تک دونوں طرف ہی خدا پر اعتقاد ایک مشترک صفت رہی ہے۔ البتہ قدیم یونانی فلسفے یا جدید سکھ مذہب میں، ان کے تخیلاتی عمل میں خدا کے بارے میں مختلف تصورات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں اکثر مذاہب اور فلسفوں میں خدا کے بارے میں پائے جانے والے تصورات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱.۴: قدیم یونانی، خدا پر یقین رکھتے تھے۔ وہ کئی خداؤں کو ماننے والے تھے اور کہتے تھے کہ مختلف کاموں کے خدا مختلف اور الگ الگ ہیں۔ البتہ افلاطون اور ارسطو ایک خدا کو ماننے والے تھے جو ہر چیز کا خالق ہے۔ لیکن ارسطو ایک سے زائد

خدا پر بھی ایمان رکھتا تھا جب کہ سقراط ایک واقعی اور عملی خدا کا معتقد تھا۔ یونانیوں کے اس نظریئے کو اب تسلیم کیا جا رہا ہے اور اسے Hellenism یونانی رسوم و رواج کو اپنانے کا نام دیا گیا ہے۔ یہ رومیوں والے کئی خداؤں کا عقیدہ ہے، جیسے اپولو، Hera اور Zeus۔ قدیم رومی دور میں مجموعی طور پر ۱۳ خداؤں کی پرستش کی جاتی تھی۔ (۳) اس پوجا کے باوجود ان کے بارے میں یہی رائے آتی ہے کہ رومی اور ان کے فلسفی و مفکرین دہریئے تھے۔ تاہم یہ نظریہ غلط ہے، کیوں کہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ان کے اکثر مفکرین بشمول فیثاغورث نے صوفیت کا آغاز کیا تھا اور صوفی مراکز بھی قائم کیے تھے۔ یہ حقیقت رومی عوام اور مفکرین کے ذہنی رویئے کو از خود آشکارا کر رہی ہے۔

۱.۵۔ سامی مذاہب

سامی مذاہب یعنی (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) لاثانی اور غیر مشروط خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں۔ تینوں مذاہب کے مطابق خدا، خالق، مبتدی (ابتدا کرنے والی)، پالنے والی اور ہر شے کو ختم کرنے والی ہستی ہے۔ اسی وجہ سے ان مذاہب کو وحدانی مذاہب کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننے والے۔ دنیا کے بڑے حصے کے مذاہب یہی تین ہیں، جب کہ سنّی اسلام ایک ارب سے زائد مسلمانوں کا سب سے بڑا مذہب قرار دیا جاتا ہے، جس کے بعد ایک ارب سے زائد کیتھولک عیسائیت کا نمبر آتا ہے۔ ان کے مقابلے میں یہودیت صرف ڈیڑھ کروڑ (دو کروڑ، مترجم) افراد کے عقیدے والا دنیا کا سب سے چھوٹا سامی مذہب کہلاتا ہے۔ یہ اعداد و شمار خود واضح کر رہے ہیں کہ دنیا کے حاوی عقائد میں ایک خدا پر یقین رکھنے والوں کی

تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کا دوسرا مطلب بھی یہ ہے کہ آج کی دنیا کی اکثریت پہلے ہی خدائے واحد کو ماننے والی ہے۔ دوسرے لوگ بھی اسی اعتقاد کے حامل ہیں، لیکن کچھ مختلف انداز سے! ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

۱.۶ غیر سامی مذاہب

غیر سامی مذاہب میں ہندومت، بدھ مت، آتش پرست، سکھ مت اور جین مت سرفہرست ہیں۔ ان مذاہب کی ابتدا واہموں سے ہوئی جنھیں ان کے مختلف بڑوں نے ایک مذہب کی شکل میں ڈھال دیا۔ ان عقائد میں ہندومت سب سے قدیم ہے، جس کی بنیاد کائنات کے تین خدا ہیں۔ ان کے ماننے والے انھی تین خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں۔ تاہم اسی کے ساتھ وہ کم و بیش تین کروڑ تیس لاکھ ماتحت خداؤں کی بھی پرستش کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ پھر بھی یہ ماننا درست ہے کہ ہندو مت میں کسی ایک خالق کا تصور ضرور موجود ہے، تاہم ایک اور قدیم مذہب بدھ مت میں کسی واضح خدا کا تصور نہیں پایا جاتا اور اسی باعث اسے ''لاادریت'' (نامعلوم) مذہب قرار دیا جاتا ہے اور جین مت ایک تخلیقی ہستی کا قائل ہے، جب کہ آتش پرست مذہب دو خداؤں پر مشتمل ہے، جن میں سے ایک نیکی کا خدا اور دوسرا بدی کا خدا ہے۔ یعنی اس میں بھی خدا کا نظریہ بالکل واضح ہے۔ سکھ مت ان تمام مذاہب میں سب سے آخر میں آتا ہے اور اس کے معتقدین بھی ایک خالق خد کے قائل ہیں۔ (۴)

۱.۷۔ تاریخ خدا

نسل انسانی کی بالکل ابتدا ہی سے، یعنی اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام کے وقت ہی سے انسانی شعور میں خدا کا تصور اہم عنصر کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ خدا کی اس

تاریخ کے مختلف ادوار سامنے آتے رہے ہیں۔قدیم دور کی ابتدا سے آج اس جدید دور تک، انسانی مراحل میں خدا کے مختلف تصورات کار فرما رہے ہیں۔قدیم دور میں چاند، سورج، ستارے، بلند و بالا پہاڑ اور چھوٹی سے بڑی ہر زندہ مخلوق کو دیکھ دیکھ کر ہر چیز کو قائم و تخلیق کرنے والے خدا پر اعتقاد کو تسلیم کیا گیا تھا۔یہ کہ ہر دیکھی جانے والی چیز اور اس سے اوپر آسمانوں میں ماورائے فطرت کوئی خالق ہستی ضرور پائی جاتی ہے۔

وسط مدتی دور چوں کہ علمی ہو چکا تھا، اس لیے صحیفوں کی تحریریں پڑھنے کے بعد انہوں نے بھی خدا پر اعتقاد رکھنا جاری رکھا تھا۔صحیفوں کی زبان بہت کھینچ لینے والی اور اپنے وقت کی ہر قسم کی شاعری اور ادبی زبان سے بالاتر ہوتی تھی۔اسی وجہ سے وہ لوگ خدا کو بھی ذہین ترین اور عالم ترین ہستی اور تمام زبانوں کا خالق گردانا کرتے تھے۔

مگر آج جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔لوگ اب مقدس صحیفوں میں پیش کردہ بیانات کو سائنسی روشنی میں پرکھ کر ہی خدا کو پہچاننا چاہتے ہیں۔جس کی خاطر وہ ان کی عبارات کو بہت سنجیدگی سے پڑھتے اور سائنسی حقائق کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔نتیجے میں سائنسدانوں کی ایک معقول تعداد نے قرآن اور انجیل کے بیانات کو جدید سائنس کے عین مطابق پایا ہے۔لہٰذا آج کے دور کے لوگ خدا کی عظیم ترین اور علیم و خبیر ہستی ہونے پر اس وجہ سے یقین رکھتے ہیں کہ قدیم دور میں اس نے اپنی کتابوں میں جن سائنسی حقائق کا انکشاف کیا ہے وہ آج کی دنیا میں بالکل صحیح نظر آتے ہیں۔

۱.۸۔ایک خالق خدا

تخلیق آدم و حوا سے پہلے خدا کیا اور کیسے کر رہا تھا؟ یہ اہم سوال ہمیں انسانی تخلیق سے بھی پہلے کے دور میں لے جاتا ہے۔یوں تو خدا ہر زمانے ہی میں ایک تخلیق کنندہ

رہا ہے۔وہ اشیاء کو انسان سے پہلے اور بعد میں بھی پیدا کرتا اور کر رہا ہے۔کائنات میں جب محض گیس اور دھواں ہی تھے، خدا نے ایک زبردست بگ بینگ (دھماکا، رتق) کیا، جس نے کائنات کو وسیع تر کر دیا۔بعدازاں سیارے وجود میں آئے اور برفانی دور شروع ہوا۔بہت طویل مدت کے بعد جب تمام سیارے ٹھنڈے ہو گئے تو سورج سے بہت مناسب فاصلے پر ایک بہترین جائے وقوع پر سیارۂ ارض کو ٹھہرایا گیا تا کہ ہر قسم کی حیات کو نشوونما و زندگی دے سکے۔بعدازاں ایک بہت ہی خردبینی بیکٹیریا سے تبدیل ہو کر ایک واضح زندہ بیکٹیریا کی شکل میں زندگی کا آغاز ہوا۔پھر مادہ سے پیچیدہ اور یک خلیاتی سے کئی خلیاتی اشیاء وجود میں آنے لگیں۔اس طرح مرحلہ در مرحلہ ہر چیز سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسان نے خدا کا علم اور اس کے کاموں اور صفتِ تخلیق کی معرفت حاصل کی۔آج کے انسانوں کے معرفت خدا کی قوت، قدیم ادوار کے انسانوں کی معرفت خدا سے اسی باعث بہت آگے ہے۔آج ہمیں خوب پتہ ہے کہ ہر چیز کی ابتدا کا سرا اس کے خالق تک اور کائنات کے نقش قدم اس کے خدا تک جاتے ہیں۔اگرچہ اس کے راستے الگ الگ ہیں، تاہم سب ایک ہی مقصود تک جا کر ختم ہوتے ہیں۔

۱.۹۔سہارنے والا خدا

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ انسان ایک پیچیدہ نوعیت کی مخلوق ہے۔جب کہ کائنات اس سے بھی زیادہ پیچیدہ تخلیق ہے۔اس لیے انسانی جسم اور کائنات کے اعمال و افعال ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ یہ گوناگوں خصوصیات ایک بہت ہی ذہین تخلیق کار اور ڈیزائنرز کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں۔لیکن دانشور حلقوں میں یہ

سوال بہت اٹھائے جاتے ہیں کہ باوجود عمدہ ترین تخلیق اور ایک خدا کے وجود ہونے کے، طبیعیاتی قوانین کی رو سے انسان اب مزید کسی نگرانی یا متحرک نظام میں شامل نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس کا جواب مشکل ہونے کی بجائے بہت آسان ہے۔ خدا خود بھی اس ''تماشے'' کو فی الحقیقت جاری رکھے ہوئے ہے۔ کیوں کہ فطرت کے قوانین کو بھی اسی نے بنایا ہے، معروف طور پر جنھیں طبیعیاتی قوانین کہا جاتا ہے اور وہ اس قدر درست اور کامل ہیں کہ اس کے بعد خدا کو مزید ملوث ہونے کی (حقیقی، مترجم) ضرورت ہی نہیں رہی۔ لیکن اس سے بھی اہم حقیقت یہ ہے کہ ان آثار، شواہد اور قوانین پر اس کی نگرانی اس قدر سخت ہے کہ کوئی بھی چیز نہ تو گرتی ہے، نہ اِدھر سے اُدھر ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک حرکت اور قانون کو باریک بینی سے مسلسل پال رہا ہے۔ اگر خدا کی یہ عظیم ترین دانش و نگرانی نہیں ہوتی تو بھاری بھرکم یہ اجسام باہم ٹکرا کر کائنات کو ختم کر دیتے! یہ اس کی مسلسل نگرانی، حصہ اور علم ہی ہے جس کے باعث کائنات اس وقت تک تباہ و برباد نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود نہ چاہے۔ اس کے نظام میں یہ پیغام از خود پنہاں ہے کہ سورج صبح نکلنے سے پہلے خدا سے طلوع ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے اور خدا اسے اس کی اجازت دیتا ہے۔ پھر ایک دن وہ آئے گا کہ خدا اسے مشرق سے طلوع ہونے کے بجائے مغرب سے طلوع ہونے کا حکم دے گا، جس کے بعد دنیا کے بالکل ختم ہو جانے کے دن بہت قریب آلگیں گے۔ (۵)

۱.۱۰۔ خلق کرنے اور پالنے کی طاقت سے ہٹ کر اس کی ایک طاقت تباہ کرنے کی بھی ہے۔ پہلے ہی ایک وسیع خالی جگہ کائنات میں ''بلیک ہول'' کے نام سے موجود ہے۔ ایک بار آسمانی دنیا کا کوئی ستارہ اگر اندر داخل ہو جائے تو پھر زندہ نہیں رہ پاتا بلکہ مرجاتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ یہ ''بلیک ہول'' تباہی و بربادی کا ''کچرا خانہ'' ہے۔

اس لحاظ سے زمین کی بھی ہر وہ چیز جو سانس لیتی ہے، آخرکار مرجاتی ہے۔ اپنی عمر کی طوالت سے قطع نظر، ہر ایک جاندار شے کو مرجانا ہے۔ چوں کہ خدا ہی آخری منزل ہے، اس لیے ہر سانس لینے والی اور نہ لینے والی ہر چیز کو اللہ برباد کر رہا ہے۔ بہت سے قدیم جانور آج موجود نہیں ہیں، جیسے ''ڈاکیے کبوتر''۔ (۶)

اور بہت ساری حیات مٹ جانے کے دہانے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ حقائق واشگاف کر رہے ہیں کہ خدا بیک وقت پیدا بھی کر رہا ہے اور مٹا بھی رہا ہے۔ اور آخرکار وہ ہر موجود چیز کو فنا کے گھاٹ اتار کر ہی رہے گا اور کائنات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مستند سائنسی حقیقت بھی یہی ہے کہ زمین سمیت ہر چیز اپنے انجام کی طرف لوٹ رہی ہے، جیسے ستارے جو بلیک ہول میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔

۱.۱۱۔ خدا کی دستاویزی تاریخ

انسان کی ممکنہ میسر دستاویزی تاریخ سات ہزار سال قبل سے کم پرانی نہیں، جو سب کی سب مختلف مقامات اور زمانوں میں ہر دور کے نمایاں افراد سے بیان شدہ اور محفوظ شدہ ہیں۔ تاریخ کی چند کتب میں سے (۱) تاریخ الامم والملوک، ازطبری (۲) الکامل فی التاریخ، از ابن اثیر اور (۳) البدایہ والنہایہ، از ابن کثیر ہیں۔ جن کے بعد وَید ہیں۔ خصوصاً قدیم ترین وَید، مثلاً رِگ وید (ہندومت کی مذہبی کتاب)۔ ان تمام کتابوں میں انسانوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جن کا خدا پر اعتقاد بھی تھا۔ لوگوں کے اس اعتقاد کو ان کی عمدہ خصوصیات گردانا گیا ہے۔ (اور حیرت انگیز طور پر) یہ تمام کتب ابتدا ہی سے دہریت کے ذکر سے خالی ہیں، تا آنکہ ایک خاص مدت کے بعد جا کر لوگوں نے خدا پر عدم یقین کا اظہار شروع کیا۔ جس کی اصلاح کی خاطر پھر

انبیاء اور اوتار بھیجے گئے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام سنجیدہ تاریخ تصدیق کرتی ہے کہ انسانی زندگی میں خدا کا وجود ان کا مضبوط اعتقاد تھا اور ہر دور میں خدا کی تاریخ مستند طور پر درج کی گئی ہے۔ یوں لوگوں کے درمیان خدا اچانک کہیں سے نمودار نہیں ہو گیا تھا کہ اس نے انہیں خود پر ایمان لانے کو کہا ہو۔ آدم علیہ السلام سے لے کر آج نوزائیدہ بچے تک، اپنی پیدائش ہی سے خدا کو ماننے کی ہدایات اور ثبوت کے ساتھ موجود رہے ہیں۔ خدا نے تو بلکہ تاریخی طور پر لوگوں پر زور دیا ہے کہ وہ اس کی ہستی پر تدبر کریں جس مقصد کے لیے کسی بھی سنجیدہ فرد کے لیے علم (کتاب) بہت ہی عقلی ذریعہ ہے۔ دوسری طرف پُرتجسس اور سوچ پر ابھارنے والی تحریر بھی ہمیشہ خود تاریخ رہی ہے۔ لہٰذا اہم بات یہ ہے کہ اس کے اندر اترا جائے اور اس کا مطالعہ کیا جائے۔

۱.۱۲۔ دنیا کے اہم مذاہب میں اکا عقیدہ

مذاہب عالم کو دو بنیادی خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابراہیمی عقائد اور فلسفیانہ مذاہب۔ ابراہیمی مذاہب میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام آتے ہیں جن میں خدا پر ایمان کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ یہودیت

ابراہیمی مذہب میں یہودیت سب سے قدیم ہے۔ اس کا بنیادی نکتہ بنی اسرائیل کا خدا کے چہیتے بندے ہونا ہے۔ اسی لیے دوسری نسلوں پر اُسے ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ اس لحاظ سے اسے ایک نسلی مذہب ہی گردانا چاہیے۔ تاہم خدا کے بارے میں ان کا نظریہ بالکل دوٹوک ہے۔ خدا کو وہ مقتدر اور اعلیٰ ترین ہستی قرار دیتے اور تمام اشیاء کا

خالق تسلیم کرتے ہیں۔ اُس کا نام انہوں نے ''جیہوواہ'' (Jehuvah) رکھا ہے۔

نجات

یہودی مذہب میں نجات کا دارومدار خدا پر ایمان اور اس کے احکامات پر عملدرآمد پر ہے۔

۲۔ عیسائیت

ابراہیمی سلسلے کا یہ دوسرا مذہب ہے۔ عیسائیت کا فلسفہ یہ ہے کہ آسمان و زمین خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور بعد میں اس نے خود کو متعارف کروانے کے لیے اپنے محبوب یسوع مسیح کو بھیجا، جس پر اعتقاد رکھ کر لوگ اپنے گناہوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ تثلیث ان کا بنیادی عقیدہ ہے، جس کا مطلب ہے کہ خدا تین میں سے ایک ہے۔ یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ اس لحاظ سے ہم نے دیکھا کہ عیسائیت میں بھی خدا پر ایمان موجود ہے۔

نجات

عیسائیت میں نجات اس امر پر ہے کہ انسان یہ اقرار کرے کہ یسوع مسیح نے ساری انسانیت کے لیے صلیب پر جان دی تھی، جس کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے اور پھر آسمان پر اپنے ''باپ'' کے پاس واپس چلے گئے۔

۳۔ اسلام

ابراہیمی سلسلے کا یہ تیسرا اور آخری مذہب ہے۔ یہ نسلی تعصب اور شرک کے بالکل خلاف ہے۔ اس کا بنیادی عقیدہ خدا کو وحدہٗ لاشریک اور نبی ﷺ کو خاتم النبیین

مانناہے۔ جب کہ خدا کو حتمی خالق، پالنے والا اور ہر ایک کو فنا کرنے والا قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے خدا پر ایمان کی وکالت کرنے والا یہ سب سے بڑا مذہب ہے۔

نجات

شرک سے پاک رہنا ہی اس میں نجات کا اصل ذریعہ ہے۔ یہ کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کیا جائے اور پیغمبر خدا ﷺ کو اس کا آخری نبی تسلیم کیا جائے۔

۱۳.۱۔ فلسفیانہ مذاہب

یہ وہ عقائد ہیں جو پہلے فلسفیانہ شکل میں تھے اور بعد ازاں باقاعدہ مذاہب کا روپ اختیار کر گئے۔ خدا کے بارے میں ان کے عقائد کا جائزہ ذیل میں لیا جاتا ہے۔

ہندومت

ہندو مطلب کا مطلب بتوں کی پوجا ہے۔ اس میں اگرچہ لاتعداد خدا پوجے جاتے ہیں، تاہم اس کا اصل خدا ''تری مورتی''، یعنی تین خدا۔ ''برہما، شیوا اور وشنو''۔ ہندو عقائد کے مطابق ''برہما'' کائنات کا تخلیق کنندہ ہے۔ ''وشنو'' سب کا پالنے والا ہے۔ اور ''شیوا'' دنیا کو فنا کرنے کے کام پر مامور ہے۔ اس لحاظ سے خدا پر ایمان اس مذہب کا بھی لازمی حصہ ہے۔

ا۔ بدھ مت

دنیا کے فلسفیانہ مذاہب کی تعداد میں ہندومت کے بعد بدھ مت کا نمبر آتا ہے۔ اس کے بانی گوتم بدھ نے گیان دھیان کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں کا رخ کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ چار نادر حقائق اور آٹھ نئے طریقے لے کر واپس آیا جن کی مدد سے دنیا کے لوگ اپنی

ابتلاؤں سے نجات پا سکیں۔ اس کے باوجود خدا کے بارے میں بدھ کا نظریہ زیادہ واضح نہیں ہے اور اسی لیے اسے ایک ''لاادری'' (Agnostic) مذہب سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ سکھ مت

فلسفیانہ مذاہب کا یہ آخری مذہب ہے۔ اس کے بانی گرونانک نے بہت طویل سفر کیے تھے جس دوران اپنے ملک کی گوناں معلومات کے علاوہ دیگر کئی معلومات بھی حاصل کی تھیں۔ سکھ مذہب اصل میں ہندومت اور بت پرستی کا ردعمل تھا۔ اس لیے اس میں خدا اور آخرت پر ایمان ایک بنیادی تقاضا ہے، جس کی خاطر اس نے اسلام سے بھی کچھ عقائد داخل کیے ہیں۔ یعنی خدا کی وحدانیت اور روز حشر کے وقوع پر ایمان! البتہ انسان کا اسی دنیا میں دوبارہ جنم وہ عقیدہ ہے جو اس نے ہندومت سے ادھار لیا ہے، پھر بھی خدا پر ایمان سکھ مت میں لازم ہی ہے۔

۳۔ آتش پرست۔ زرتشت مذہب

آتش پرستی دنیا کا وہ سب سے قدیم مذہب ہے جس کی تاریخ چھ سو سال پرانی ہے۔ اس کا بانی زرتشت تھا۔ ابتدا میں یہ آگ کی پوجا کرواتا تھا۔ زرتشی اصولوں میں دو خداؤں یزداں ''اور اہرمن کا تصور'' بنیادی ہے۔ یزداں جو نیکیوں کا خدا ہے اور اَہرمن جو بدی کا خدا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی خدا کا تصور موجود ہے، تاہم اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

نجات

اس مذہب میں نجات کا کوئی واضح نظریہ موجود نہیں ہے، سوائے اس کے کہ انسان تاعمر نیکیاں کرتا رہے۔

۴۔ جَین مت

مہاویرا کے قائم کردہ قدیم مذاہب میں جَین مت، دراصل ایک قسم کا بدھ مت ہی ہے۔ اس عقیدے کے تحت جَین لوگ خدا ''مہاویرا'' کی پرستش کرتے ہیں۔ ایک خدا کی جگہ مہاویرا کی پرستش بھی واحد خدا کی پرستش نہیں ہے، کیوں کہ مہاویرا بھی خدائی ہستیوں میں ۲۴ ویں نمبر کا خدا تھا۔ اس کے باوجود طے ہے کہ جین مت میں خدا کا نظریہ موجود ہے۔

نجات

اس میں یوم جزا کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا، اس لیے اس بارے میں کوئی ہدایت بھی موجود نہیں ہے۔ بس ایک ہی ہدایت ہے کہ دنیا میں نیک بن کر رہو اور کسی ذی روح کو موت نہ دو خواہ وہ کوئی جرثومہ ہی کیوں نہ ہو!

۱.۱۴۔ روحانیت نئی ایجاد ہے؟

جیسا کہ ہم نے اوپر سمجھا کہ مذاہب، خدا پر اعتقاد اور اس کے رسوم نئے نہیں بلکہ قدیم ہیں۔ اور پیدائش انسان ہی سے اس میں موجود رہے ہیں۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب سے بھی روحانیت کا گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کا اہم حصہ روحانیت بھی قدیم ٹھہرا۔ درست (Right) طریقہ کار کے مطابق نئی دریافت یا ایجاد کردہ چیز یا اصول کو مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس کی خاطر اسے ثبوتوں کی، دماغوں میں مسلسل پیوستہ کرنے کی اور مالیاتی فراہمی کی مسلسل ضرورت درکار رہتی ہے۔ چناں چہ ایک بار اگر ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ مذہب اور انسانوں کی روحانی فطرت، دونوں ہی قدیم ہیں تو پھر نیا کیا باقی رہ جاتا

ہے؟ وہ کیا حقیقت ہے جسے ثبوت کے ساتھ معاشرے میں نفوذ کرنا لازم ہو؟ ظاہر ہے کہ دہریت تو ہو نہیں سکتی، جس کی بنیاد محض قیاس آرائیاں ہی ہوں!

۱.۱۵۔ ہزاروں سال سے بھی زیادہ قدیم مصری تہذیب بھی معاشرے کے ایک بنیادی عنصر کے طور پر روحانیت کو سموئے ہوئے تھی۔ اس قدر زیادہ کہ مرنے کے بعد بھی وہ اس کا وجود تسلیم کرتے تھے اور روحانی عروج کے حصول کے لیے مختلف عبادات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ مَری ہوئی شخصیات کو اگر وہ محفوظ ترین شکل میں ممّی کرتے تھے، تو وہ بھی فی الاصل روحانیت ہی کا ایک قدم تھا۔ دوسری جانب قدیم جاپانی، چینی اور منگول تہذیبوں میں بھی روحانیت کا گہرا اثر و رسوخ پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ Tangrism نامی مذہب خالصتاً روحانی امور پر مشتمل تھا۔ یہ ایک عقلی دلیل ہے کہ انسانی زندگی پر روحانیت کا کس طرح گہرا دخل رہا ہے۔ روحانیت کی کتنی قسمیں ہیں؟ ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱.۱۶۔ مذہبی روحانیت

بپتسمے اور اسلامی روحانیت (بذریعہ صوفیت یا تزکیہ نفس) دنیا بھر میں سب سے زیادہ عمل کیے جانے والے افعال ہیں اور ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود آج بھی زندہ ہیں۔ اپنے مقصد، روحانیت کے حصول کے لحاظ سے، دونوں طریقہ ہائے کار ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ ''یقین کو پاک کرو اور خدا کے قریب ہو جاؤ!'' یہ ایک سامی روحانی طریقہ کار ہے، جو اب غیر سامی روحانیت میں بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہندو مت میں ایک مکمل کتاب بنام اَتروید، منتروں سے بھری ہوئی ہے۔ یعنی ان الفاظ سے، جو روحانیت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زبان سے ادا کیے

جاتے ہیں۔(اَتر وید، چار خاص ویدوں میں سے ایک کا نام ہے)۔دوسرے قدیم
مذاہب مثلاً ''تاؤازم'' میں بھی روحانیت کا حصول بہت اہم ہے۔تاؤازم تو بلکہ بیشتر
صوفیانہ خیالات اور مشقوں ہی کا مجموعہ ہے۔ بدھ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ
روحانیت کے حصول میں گذارا تھا اور اس کے راہب آج بھی اس پر عمل پیرا ہیں۔

جین مذہب کے لوگ سنیاس، بے لباسی اور کھانے سے مکمل و دانستہ پرہیز کے
ساتھ روحانیت کے لیے کوشش کرتے ہیں۔سب کے مقاصد ایک ہی ہیں، مگر راستے
جدا جدا ہیں۔

۱.۱۷۔غیر مذہبی روحانیت

لیکن کیا اس کا کوئی وجود ہے؟ ہمارے سامنے یہ سوال پہلے ہی مرحلے پر آن کھڑا
ہوتا ہے۔مگر جواب بہت واضح ہے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ روحانیت ہے ہی
سارے کا سارا مذہب سے متعلق! اور اس کا آغاز بھی مذہب ہی سے ہوا ہے۔سو کیسے
ممکن ہے کہ اصل ماٰخذ (مواد) کی شمولیت کے بغیر ایک مخصوص جذبہ رکیفیت کہیں اور
سے بھی حاصل ہو جائے؟ تو پھر ''روحانی مگر لامذہبی'' اور ''غیر مذہبی روحانیت'' کا کیا
مطلب ہے؟ کوئی شخص جو مذہب سے دور ہو اور پھر بھی روحانیت کا درجہ حاصل کرنا
چاہے، تب بھی کسی نے کسی حد تک اسے مذہبی مشق مثلاً یوگا تو کرنی ہی ہوگی جو
ہندومت ہی کی ایک مذہبی شکل ہے۔خلاصے کے طور پر کہنا چاہیے کہ مذہب یا مذہبی
مشق کے بغیر آپ کو روحانیت کا مقام حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔جو بذات خود ایک مذہبی
عبادت ہی کہلائے گی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ لامذہب بھی رہیں اور روحانیت بھی
حاصل کرلیں۔(یعنی غیر مذہبی روحانیت کا کوئی وجود نہیں ہے۔مترجم)

۱.۱۸۔روحانیت اہم کیوں ہے؟

امن! روحانیت کی اہمیت اسی کی خاطر ہے۔روحانیت کی ضرورت، انفرادی اور
اجتماعی دونوں لحاظ سے ایک پُرسکون زندگی گذارنے کی خاطر ہی محسوس کی جاتی ہے۔
اپنی ذات کے اندر امن وسکون کو حاصل کرنے کے لیے انسانوں کو روحانی رہنما کی
ضرورت ہوتی ہے۔راہبوں، عیسائی پادریوں اور مسلم صوفیاء کو معاشرے کے سب
سے زیادہ پُرامن اور قانون کی پیروی کرنے والے افراد سمجھا جاتا ہے۔جب کہ دنیا
میں تشدد اور خودکشی کے بیشتر واقعات محض اندرونی غیر سکونی کے باعث جنم لیتے ہیں۔
سوانہی مقامات پر روحانیت اپنا کردار ادا کرتی ہے۔لاادریت، غیر مذہبی اور دہریئے
لوگوں میں بے چینی اور کرب ان افراد کی نسبت، آخر ان لوگوں میں کیوں کہ ہوتی ہے
جن کا تعلق مذہب سے ہے؟ یہی ذہنی بے چینی انسان میں غم وغصہ پیدا کرتی ہے جو یا
تو اسے خود اپنی جان لینے پر راغب کرتی ہے یا پھر دوسروں کی جان لینے پر اکساتی
ہے۔یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاشرے کے لوگوں کے مقابلے میں غیر مذہبی معاشرے
میں رہنے والے لوگوں کی نسبت ذہنی سکون کی شرح بہت بلند ہوتی ہے۔ یہ ایک
رہنمائی ہے کہ خوش باش زندگی گذارنے کے لیے فی الاصل روحانیت ہی کی ضرورت
ہے اور اس مقصد کی خاطر اعلیٰ کلاسز میں اس مضمون کو ایک ناگزیر سبق کی حیثیت سے
بھی پڑھایا جانا چاہیے۔

۱.۱۹ خلاصہ رنتیجہ

مختلف مذاہب اور فلسفوں میں عقائد ہمیں خدا کے بارے میں زیادہ نظر آتے
ہیں جو اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ نسل انسانی کے آغاز ہی سے خدا پر ایمان ہر انسان کا

اٹوٹ حصہ رہا اور تاعمر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے۔ مزید ہم یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں خدا کی اہمیت سدا قائم رہی ہے۔ جب کہ اس کے انکار کی کوئی بڑی مثال نہیں پائی جاتی۔ اس لیے مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حتمی حقیقت یہی ہے کہ خدا موجود ہے اور اس کا انکار ایک بے بنیاد بات ہے۔ اسی طرح روحانیت بھی انسانی زندگی کا وہ پہلو ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ تو انسان کے لیے سدا مفید ہی ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس کے برعکس غیر مذہبی روحانیت، یا مندرجہ بالا بیان کے برعکس کوئی اور موقف رکھنا، کافی وزنی دلائل کا محتاج ہے۔ ایک مشق جو آج تک نہیں کی گئی۔

حوالہ جات

1. Merriam-webster.com>Dictionary>God
2. En.Wikipadia.org>wiki>God_gene
3. Aliyki (1994), The Gods and Goddesses of Olympus, Harper, Collins Publishers,USA.
4. Alimardi, Mohammad Mehdi, (2013) Reliogious Inquiries-God in Sikhism, V12, No.4, Summer and Automn, 77-92
5. Sahih Al-Bukhari, Hadith No.3199 (2020)
6. Boucher, H. The Causes of Extinction of the Passage, Pigeon, Enrique, Chapther 1.

باب دوم

۲.۱۔ رچرڈ ڈاکنس کی کتاب God Delusion کا تعارف

رچرڈ ڈاکنس کی یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں طبع ہو کر آئی تھی۔ پہلے وہ نسبتاً کم تر موضوعات پر آٹھ کتابیں لکھ چکا تھا، جن میں دو مشہور Blind Watchmaker اور The Selfish Gene شامل ہیں۔ God Deception اس کی نویں کتاب تھی، جس نے دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب یکا یک کھینچ لی اور عالمی مارکیٹ میں عرصہ دراز تک بیسٹ سیلر رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دنیا بھر کے ملحدوں کو اس کتاب سے ایک علمی زبان اور نمائندگی مل گئی تھی۔ ملحد دنیا کے لیے یہ گویا جشن کی سی کیفیت تھی۔ چارلیس ڈارون کے نظریہ انکارِ خدا کے ایک سو سال بعد یہ واقعہ ہوا تھا اور چارلیس ڈارون کی کتاب Descent of Man یا Origin of Species نے انسان پر جو اثرات چھوڑے تھے، رچرڈ ڈاکنس کی کتاب God Delusion نے اس پر ہو بہو وہی اثرات مرتب کیے، تاہم یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ڈارون کے دور کے بعد سے ڈاکنس کے دور تک پہنچتے پہنچتے، سائنس اور ٹیکنالوجی نے بہت ترقی حاصل کر لی تھی۔ اسی وجہ سے God Delusion نے بھی سائنسی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر لی۔

۲.۲۔ ہم واپس God Delusion کی طرف آتے ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں ڈاکنس۔ پس منظر اور تعارف پیش کرتے ہوئے ٹی وی پروگراموں میں

مباحثوں کے تجربات بیان کرتا ہوا کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتا ہے۔ پہلے باب کا نام اس نے ''مذہب سے سخت بیزار فرد'' رکھا ہے۔ اور خود بھی ایسا ہی ظاہر کیا ہے اور اپنے نظریات کو اسی باب میں مختلف انداز میں بیان کرتا ہے۔ دوسرے باب میں ''خدا کا مفروضہ'' میں وہ مختلف مذاہب میں خدا کے الگ الگ نظریات کی وضاحت کرتا ہے۔ جب کہ تیسرے باب میں ''وجودِ خدا پر دلائل'' میں وہ بعض مذہبی لوگوں کے دلائل اور اپنا ذاتی جواب سامنے لاتا ہے۔ چوتھے باب ''خدا یقینی طور پر کیوں موجود نہیں ہے؟'' میں وہ اپنے ملحدانہ نظریات کا اثبات کرتا اور دلائل سامنے لاتا ہے۔

پانچویں باب ''مذہب کی جڑیں'' میں سابقہ باب کو مزید پھیلاتے ہوئے تاریخ اور مذہب کو ساتھ ساتھ بیان کرتا ہے۔ چھٹا باب ''اخلاقیات کی بنیادیں۔ ہم اچھے کیوں ہیں؟'' کے نام سے ہے جہاں اس نے انسانی قدروں اور خدا کے ساتھ ان کے تعلقات کو پیش کیا ہے۔ ساتواں باب ''اچھی کتاب اور بدلتی دنیاوی قدریں'' ہے، جس میں اس نے سیاست اور مذہبی تحریروں کو جمع کیا ہے۔ آٹھواں باب ''مذہب کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ اس قدر مخالف کیوں ہے؟'' اس نے مکمل طور پر مذہب پر تنقید اور جدیدیت کی تعریف کے لیے وقف کیا ہے اور آخری سے پہلے نویں باب کا نام اس نے ''بچپن کا ستایا جانا اور مذہب سے فرار'' رکھا ہے، جہاں اس نے مذاہب کی پیشگی دعوے شدہ چند کمزوریوں والے زندگی کے تجربات کا تذکرہ کیا ہے۔ اور کتاب کے آخری باب ''ایک بہت ہی مطلوب خلا'' کو اس نے مذہب اور مذہبی روایات کے تمسخر اور مذاق پر ختم کیا ہے۔ بالکل اختتام پر اشاریہ، اقوال اور نوٹس پائے جاتے ہیں، جہاں جا کر کتاب اختتام پذیر ہوتی ہے۔

۲.۳ـ کتاب کے فلاسفرانہ نکات

اپنی اصل میں یہ کتاب مجموعی طور پر کسی باقاعدہ تحقیق طریقہ ہائے کار سے ہٹ کر محض فلسفیانہ انداز رکھتی ہے۔ کچھ حصے محض سیاسی ہیں، کچھ صحافیانہ نوعیت کے ہیں، جب کہ کہیں کہیں سائنسی انداز بھی جھلکتا ہے۔ باب اول سے لے کر باب دس تک پوری کتاب الگ الگ قسم کی طوالت پر مشتمل ہے اور ہر بار کوئی نئی داستان شروع کر دی جاتی ہے۔ ڈاکنس نے تجزیاتی و تحلیلی نقطہ نظر اکثر و بیشتر محض خبروں اور واقعات تک ہی محدود رکھا ہے، جس کے باعث گہری تحقیقی سوچ اور غیر جانبدارانہ نقطہ نظر قربان ہوتے نظر آتے ہیں۔ کتاب کی ابتدا ہی میں وہ اپنے بیانیے میں جمود لیے نظر آتا ہے اور اختتام تک اس کا یہ انداز بدلتے نہیں پاتا۔ ذیل میں ہم ہر باب میں پیش کیے گئے اس کے فلسفیانہ نکات کا تفصیلی جائزہ اور تعارف پیش کریں گے۔

ڈاکِسن کا پیش لفظ

پیش لفظ میں ڈاکِسن نے مختلف زاویوں سے اپنے نظریات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کے مصائب کا ذمے دار مذہب پر اعتقاد رکھنا ہی ہے۔ ''مذہب کے بغیر دنیا'' وہ لکھتا ہے ''تصور کریں جس میں کوئی خودکشی نہیں، کوئی ۹/۱۱ نہیں، کوئی ۷/۷ نہیں، کوئی صلیبی جنگ نہیں، کوئی چڑیل اور جادوئی عمل نہیں، کوئی اسلحہ نہیں، کوئی بھارت کی تقسیم نہیں، کوئی فلسطینی اسرائیلی جنگ نہیں، کوئی مسلم سرب، کروشیا عیسائی جھڑپیں نہیں، یہودیوں کے خلاف عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب پر کوئی عذاب و مذمت نہیں، کوئی شمالی آئرلینڈ کے ہنگامے نہیں، کوئی قتل برائے عزت و وقار نہیں، چمک دمک میں ڈوبا ہوا بالوں والا، ٹی وی چینل پر بیٹھا ہوا مذہبی عیسائی پیشوا جنگ بھڑکاتا اور پیسے بٹورتا ہوا نہیں، ذرا تصور کریں کہ قدیم مجسموں کو دھماکے سے اڑانے والے کوئی طالبان نہیں، توہین مذہب ہر سر اڑا دینے والی کوئی سزا نہیں، اپنی جلد کی ایک انچ نمائش کرنے والی عورت پر کوڑے کی کوئی سزا نہیں......وغیرہ''

تجزیہ

مندرجہ بالا پیش لفظ میں ڈاکِسن نے بہت ہی عیاری کے ساتھ دنیا بھر کے جرائم کو ہمیشہ کے لیے یکبارگی طور ہی پر مذہب کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ دنیا کی ہر اقتصادی، نسلی، سیاسی اور نفسیاتی محرومیوں کو اس نے الفاظ کے گورکھ دھندے کے ساتھ مذہب سے جوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ کوئی بھی مذہب اپنے پیروؤں کی تعداد سے قطع نظر، تشدد کی کبھی ترغیب نہیں دیتا۔ ۷/۷ (برطانیہ) اور ۹/۱۱ (امریکا) کے بارے میں مختلف نظریات گردش میں ہیں، تاہم آخر کار سب کا سرا بہرحال سیاسی ہی

برآمد ہوتا ہے۔ اسلام تبلیغ کرتا ہے کہ کسی کی جان لینے کے بجائے اس کا تحفظ کیا جائے۔اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان اسلام کی تعلیمات سمجھنے میں غلطی کرتا ہے تو وہ دراصل اسلام کی غلطی نہیں بلکہ ماننے والے کی غلطی ہے۔ڈاکنس اپنے شذرے میں جب گولے بارود کا ذکر کرتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی مذہبی تنظیم گولے بارود بنانے کے کارخانے نہیں رکھتی اور نہ قائم کرتی ہے۔دنیا برباد یہ گُل دھماکہ خیز مواد مذہبی نہیں، دنیادار افراد بناتے ہیں۔ مجھے بتاؤ Lockhead Martin کیا کوئی مذہبی کارخانہ ہے؟ (سارا تماشہ، ساری بربادی۔مترجم) دولت ہی کی بنیاد پر ہے مذہب سے جس کا کوئی تعلق نہیں۔ملکوں کی تقسیم اور ملک گیری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکنس آسٹریلیا اور کینیڈا کا تذکرہ کرنا بھول جاتا ہے جنہوں نے بھارت ہی کی مانند برطانیہ سے (سیاسی، مترجم) آزادی حاصل کی تھی۔کینیڈا اور آسٹریلیا تو دونوں ممالک بیک وقت عیسائی تھے (پھر بھلا اس میں مذہبی رنگ کہاں سے داخل ہوگیا؟۔مترجم) یہ تو بنیادی انسانی حقوق (آزادی) کا سوال تھا جسے دنیا خود بھی تسلیم کرتی ہے۔لیکن بے چارا ڈاکنس مندرجہ بالا مثال میں جبری طور پر مذہب کو بھی داخل کر دیتا ہے۔

مترجم کے خیالات

جس فلسطین اسرائیل تنازع کا ڈاکنس تذکرہ کرتا ہے، اصولی طور پر وہ دو عقائد کا معاملہ ہے۔ عالمی طاقتیں سلگتے ہوئے اس مسئلے کو بھی آسانی سے ختم کرسکتی تھیں۔ اول تو ایک ہزار سال بعد یہودیوں کو فلسطینی عربوں کے آباؤ اجداد کے صدیوں پرانے علاقے میں جبراً لا بسانا، عالمی طاقتوں کا خود ایک جانا بوجھا کھیل تھا تاکہ اس سے ایک طرف یورپ میں یہودی فتنہ گروں سے نجات حاصل کی جائے اور دوسری جانب

عرب مسلمانوں کی متحدہ قوت کو پاش پاش کیا جائے۔یہودیوں کے خلاف ہولوکاسٹ (فسانہ) مسلمانوں نے نہیں، خود یورپی عیسائیوں نے مسلط کیا تھا۔اس لیے تلافی کے طور پر ملکہ برطانیہ وکٹوریہ اور وزیر خارجہ لارڈ بالفور کو ان کے لیے ایک علیحدہ خطہ خود یورپ ہی میں علیحدہ کرنا چاہیے تھا۔ دوم دونوں عقائد کے لیے وہ فلسطین میں بھی بقائے باہمی کے اصول وقوانین لاگو کرسکتی تھیں۔لیکن ہر فرد دیکھ رہا ہے کہ ان کی واضح ہمدردیاں مسلمانوں کے بجائے یہودیوں کے ساتھ ہیں۔ جب امریکہ اور اقوام متحدہ دنیا بھر، خصوصاً تیسری دنیا کے ممالک سے عورتوں کی مجنونانہ برہنگی، شادی کے بغیر ازدواجی زندگی، اور خود مختار ممالک میں ہر قسم کی آزادانہ مداخلت کو تلوار کی نوک پر منوا سکتے ہیں، جن کی عدم اطاعت میں ان کا دانہ پانی بھی بند کرسکتے ہیں، تو فلسطین کی زمین پر باہر سے آئے ہوئے گروہ پر امن وامان اور حقوق ومساوات کی شرائط کیوں عائد نہیں کرسکتے؟ دونوں عقائد کے درمیان انہوں نے ہمہ وقتی نفرت اور جنگ کے دروازے چوپٹ ہی کھلے رکھے ہیں۔ پھر جب ان میں وقفے وقفے سے خونی تصادم ہوتا ہے، جن میں اسرائیل کا برائے نام اور فلسطینیوں کا تمام تر نقصان ہوتا ہے، تو پھر اسے مذہب کے نام پر یہودیوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہودیوں کے خلاف یورپ بھر میں اگر ہولوکاسٹ پر بولنا اور لکھنا قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائے قید سے گذارا جائے تو عالمی طاقتوں کی نفرت کے کھیل کا پردہ از خود چاک ہوتا نظر آتا ہے۔

ہو بہو یہی معاملہ ہندوپاک میں کشمیر کا بھی ہے۔ ایک سلگتا ہوا مسئلہ جسے برطانوی باؤنڈری کمیشن کے تحت زبردستی کھلا رہنے دیا گیا۔ ۷۵ سالوں کے بعد بھی صرف برطانیہ ہی نہیں کوئی بھی عالمی طاقت جبراً ختم کروانے کے موڈ میں نہیں ہے۔

لاکھوں اہل کشمیر کے خون کا ذمے دار صرف اور صرف برطانیہ ہے، جسے آج بھی اپنی کوتاہی اور جرم کا احساس نہیں ہے۔ ان کا نکتہ فقط یہ ہے کہ کشمیر ہرگز بھی پاکستان میں شامل نہ ہونے پائے۔ اقوام متحدہ نے ۷۵ سال پہلے طے کر دیا تھا کہ بھارت اپنے مقبوضہ خطے پر آزادانہ استصواب رائے کروائے گا، لیکن پون صدی کے دوران اقوام متحدہ کا یہ فیصلہ ہواؤں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔

ایسی صورت میں زور وشور کے ساتھ دنیا کی جنگوں کو مذہب، خصوصاً اسلام کے ساتھ جوڑنا اور پھر دنیا کے دکھوں کا اصل سبب اسی کو قرار دینا ایک واضح جہالت اور کھلا تعصب ہے۔ اس قسم کی ذہنی سوچ اور تجزیے کو کسی بھی پیمانے سے سائنسی تحقیق قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عزت ووقار پر قتل کے معاملے پر بھی اسے دوبارہ غور کرنا چاہیے۔ اکثر اوقات یہ قتل باہمی دشمنی اور روپے پیسے کے لین دین پر ہوتے ہیں۔ مزید برآں جب کوئی شخص کسی غیر مذہبی کمپنی میں کام کرتا ہے، تعلیم بھی اس نے خالص دنیاوی تعلیمی ادارے سے لی ہے، اور ڈگری بھی اسے ویسی ہی ملی ہے، تو ایسا قتل اس کا ذاتی فعل ہی بنتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مذہبی شخص لوگوں کو لوٹتا ہے تو اُسے مذہبی اشتعال کہا جاتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں کہتا کہ پہلے والے قتل کی ذمے داری لادینی تعلیمی نظام پر ہے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکنس اپنے دلائل کی خاطر مزید چالبازیاں کرتا ہے۔ کہاں ہے وہ عورت جس پر اپنی جلد ایک انچ کھول دینے پر کوڑے پڑتے ہوں؟ جب کہ اس کی وجوہات بھی دو ہو سکتی ہیں۔ یا تو ڈاکنس کو کوڑے لگانے کی مذہبی شرائط کا علم نہیں ہے، یا پھر وہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا ہے۔ خاتون کو کوڑے صرف اسی صورت میں مارے جاتے ہیں جب کہ اس نے زنا اور بدکاری کا جرم کیا ہوا۔ جسم کی خوبصورتی نمایاں کرنے اور گلے و کمر کھولنے پر

یہ حد کبھی جاری نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ اگر کہیں ایسا ہوا ہے تو یہ کوڑے لگانے والے کی اپنی اپج ہے، نہ کہ اسلامی قانون کی کوئی مشق۔ طالبان کے معاملے میں بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں (کبھی کبھی مذہبی شدت پسندی، مذہبی اصولوں کو پامال بھی کر دیتی ہے، مگر یہ صرف ذاتی معاملہ ہے۔ مترجم)

سو اس لحاظ سے مصنف نے اپنے بیانیے سے جو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں ثبوت کا زبردست فقدان ہے۔ نظر یہی آتا ہے کہ مصنف نے ہر جنگ وجدل کو اپنی ذہنی منطق کے مطابق لازماً مذہب (یا خدا۔ مترجم) سے جوڑنے کی مشق کی ہے۔

۲.۵۔ باب اول

کتاب باب اول کے اولین حصے سے گذرتے ہوئے جہاں خدا کے بارے میں آئن اسٹائن کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ چند ایسے سانحات/واقعات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کہیں ماضی میں رونما ہوئے تھے۔ ڈاکنس نے ان کا ذکر کرتے ہوئے جب ڈنمارک نے پیغمبر اسلام کے (نعوذ باللہ) کارٹون بنانے پر اپنے نظریے اور مذکورہ اخبار کے کردار کا دفاع کیا ہے۔ دیباچے میں اس نے جن دو افراد Sam Harris اور ابن وراق کا حوالہ دیا ہے جو اپنی واہی تباہی گفتگو کے لیے ویسے ہی معروف ہیں۔ اسی سے آسانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکنس کن قسم کے افراد سے متاثر ہے اور کس قسم کی ذہنی فکر کا حامل ہے؟

تحلیل وتجزیہ

معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والا کوئی بھی حادثہ/واقعہ، دو اہم وجوہات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اول تو سماجی روایات و رسومات کے نتیجے میں، جنھیں معمول کے

مطابق ہی جانا جاتا ہے۔ دنیا جیسے جیسے اپنی حدود سے نکل کر سمٹ رہی ہے، اسی طرح سماجی اخلاقیات بھی حدود سے نکل کر عالمی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی مختلف واقعہ دنیا کے کسی ایک حصے میں ہوتا ہے تو تمام ہی دنیا اسے دیکھ رہی اور متاثر ہو رہی ہوتی ہے۔ تاہم اُس کے عالمی اثرات مختلف ممالک کی معاشی وسیاسی حیثیت کے لحاظ سے ہی سامنے آتے ہیں۔ یہی معاملہ توہین مذاہب کا ہے، جن کا تعلق مقدس شخصیات اور کتب سے ہے۔ اگر ایسی کوئی توہین کہیں کی جاتی ہے تو بُھلا دیا جاتا ہے کہ اس کے منفی اثرات دور دراز ممالک پر بھی پڑیں گے۔ سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی ڈینش اخبار اس قسم کے توہین آمیز کارٹونس شائع کرتا ہے تو اس کا واضح مطلب دنیا بھر کے ایک ارب ستر کروڑ مسلمانوں کو تشدد اور غیض وغضب کی طرف دھکیلنا ہے۔ پھر جب مسلمان ہر سطح پر اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو پھر ان پر اچانک دہشت گرد ہونے کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ کیا اس صورت میں یہ ایک جانی بوجھی سازش نظر نہیں آتی؟ مسٹر ڈاکنس ایسا ہی کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ ایک بڑا سوال ہے۔ اگر وہ قوانین توہین مذاہب پر حرف حرف گیری کرتا ہے تو اسے یہ بھی بتانا چاہیے کہ دنیا بھر میں یہودیوں کے ہولوکاسٹ پر گفتگو کرنا کیوں غیر قانونی ہے؟ ظاہر ہے اسی وجہ سے کہ یہ ایک حساس موضوع ہے، جو دنیا بھر کے ڈیڑھ کروڑ یہودیوں کے جذبات کو مشتعل کر سکتا ہے۔ اگر ایسا قانون بنانا جائز ہے تو ڈاکنس پھر یہ کیوں نہیں بتاتا کہ دنیا بھر کے ایک ارب ستر کروڑ مسلمانوں کے حساس مذہبی معاملے پر قانون بنانا بھی کیوں غلط اور مذہبی ہوگا؟ خود مختار ممالک بے شمار قوانین بناتے اور باقاعدگی سے ترمیمیں کرتے ہیں؟ اور کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہوتا تو صرف اسی کو اس قانون پر اعتراض کیوں ہے؟ اگر کوئی فرد یا قوم عالمی مذاہب وعالمی قوموں کے مسلمہ مذہبی

اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ دراصل دنیا کے قائم امن کو داؤ پر لگاتا ہے۔ کیا اسے کوئی دانش مندانہ قدم کہا جائے گا؟۔

۲.۶۔ باب دوم: ''خدا کا مفروضہ''

اس باب میں ڈاکسن نے مذاہب کے مختلف نظریات اور اصولوں پر بحث کی ہے۔ اپنے بارے میں بھی وہ کہتا ہے کہ ایک مذہب اس کا بھی ہے اور نام اس کا ''دہریت'' ہے۔ لہٰذا دوسرے مذاہب وعقائد کے اصولوں کا وہ اپنے مذہب کے اصولوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ بہرحال اس باب کا اصل مقصد خدا کا مفروضہ ہی ہے۔ لیکن خدا کے مفروضے کی وضاحت کی بجائے وہ پس اپنے نظریات ہی بیان کرتا ہے۔ یہاں اس نے مختصر طور پر کثیر الخدائی، وحدتِ خدائی، لادینیت، لاادریت اور NOMA وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ NOMA کا مطلب ہے Non Overlapping Magestria یعنی مذہب اور سائنس کو دو الگ الگ خانوں میں رکھنا اور ان کا باہمی ٹکراؤ نہ ہونے دینا۔ مترجم)

تحلیل وتجزیہ

مذاہب عالم کے موضوع پر فلسفیانہ طور پر مختلف مذہبی نظریات پر مباحثہ، ڈاکسن کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ڈاکنس کسی مذہب پر یقین بھی نہیں رکھتا لیکن اس پر گفتگو کرنا ضروری بھی سمجھتا ہے۔ اولین طور گفتگو پر کئی خداؤں کے نظریئے پر کی گئی ہے اور پھر بڑی چابک دستی سے اسے واحد خدا کو ماننے والی اکثریت پر تنقید کے لیے موڑ دیا گیا ہے۔ خدائے واحد کے نظریات پر گفتگو کیا کی گئی ہے کہ اس کا

دوسرا پروف

مذاق اڑایا گیا ہے۔ بعض گمنام افراد کے اقوال پیش کر کے دنیا میں آج تک اس مذہب پر قائم سب سے بڑی اکثریت کی تضحیک کی گئی اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ ایک گونہ نفرت کا اظہار کیا گیا۔ اس کے برعکس لادینیت اور لاادریت کی خوب تعریف کی گئی ہے، جس سے مصنف کا جھکاؤ اس جانب از خود ہی آشکار ہوتا ہے۔ باب زیر بحث میں سائنسی انداز تحقیق اور تجزیہ مفقود ہے جب کہ تنقیدی اور نفرت انگیز ذہنیت واضح طور پر ابھرتی ہے۔

۲.۷۔ باب سوم: وجودِ خدا پر دلائل

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اس باب میں سائنسی اندازِ فکر سامنے آنا چاہیے تھا، لیکن حیرت انگیز طور پر خالص فلسفیانہ رنگ بکھرا نظر آتا ہے۔ خدا کے وجود کے بارے میں ڈاکنس نے مختلف فلسفیانہ طریقے اپنائے ہیں، لیکن نہ اس لیے کہ وجود خدا کے دلائل کا جائزہ لیا جائے بلکہ اس لیے کہ ہر فلسفیانہ دلیل کے بعد اپنا ایک واضح فیصلہ سنایا جائے۔ باب کے بعد کے حصے میں ڈاکنس نے بعض واقعات کا حوالہ دے کر خدا کے وجود کی نفی کرنے کے لیے اپنی زندگی کے تجربات کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ نقطہ نظر کس حد تک قابل قبول ہے، اس کا تجزیہ کرنا قارئین پر چھوڑا جاتا ہے۔

تحلیل و تجزیہ

اس باب کو ڈاکنس، جیفرسن کا قول سامنے لاتے ہوئے شروع کرتا ہے کہ دینیات کی پروفیسر شپ کو ہمارے تعلیمی اداروں میں ہرگز بھی جگہ نہیں دینی چاہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیوں؟ آپ اور آپ جیسے دیگر لادین لوگ مذہب اور مذہبی

شخصیات سے اتنے متنفر کیوں نظر آتے ہیں؟ اس انتہائی وسیع تحقیق اور دینی شعبے کو آپ بند کرنے کے شوق میں کیوں ہیں؟ وہ تحقیق جو مذہب کے حق یا مخالفت میں کی جاتی ہے، اسی دوجہتی تحقیق کے نتیجے میں دونوں طرف کے دلائل بھی سامنے آتے ہیں اور دونوں نقطہ ہائے نظر میں توازن بھی نظر آتا ہے۔ مذکورہ بالا تبصرے کے نتیجے میں مصنف محض اپنا رواجی نقطہ نظر ہی سامنے لاتا ہے۔

دہریوں کی تحریروں کے بعد تو پھر خدا کے وجود پر دلائل قبول ہی نہیں کرنے چاہئیں، اس کے باوجود اگر کسی حقیقی زندگی کے کچھ تجربات لینے ہی ہوں تو غیر جانبدارانہ تجزیوں کی خاطر دہریوں کو اپنے تجربات کا تذکرہ بھی ضرور کرنا چاہیے۔ ڈاکنس نے ایک اور حرکت یہ بھی کی ہے کہ اس باب میں اس نے انجیلوں کی آیات تو دی ہیں، لیکن افسوس ناک طور پر قرآن کی آیات بالکل بھی نہیں لیں۔ اور (انجیل سے بھی) اس نے محض وہ آیتیں چنی ہیں جو منفی ہیں اور وہ تمام آیات یکسر نظر انداز کر دی ہیں جن میں اعلیٰ فلسفیانہ مواد اور ناقابل تردید حقائق پائے جاتے ہیں۔ اپنی اصل مین وجودی دلائل اگرچہ خالصتاً فلسفیانہ ہیں، لیکن نقطہ نظر جب دو فریق میں مختلف ہوں تو دونوں کے نقطہ نظر کو درست طور پر پرکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دونوں فلسفوں کا تجزیہ کیا جائے اور پھر فیصلہ کرنے کے لیے متصادم خیالات کو پیش کرنے اور سننے والوں کے سامنے چھوڑ دیا جائے۔

۲.۸۔ باب چہارم: ''یقینی طور پر خدا کیوں نہیں ہے؟''

اس باب میں ''پیٹ میں سے خرگوش'' بالآخر باہر نکل ہی آتا ہے۔ گزشتہ تین ابواب میں خود کو بہت بڑے تجزیہ نگار کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اب وہ براہ

راست دہریاتی مقصد کی طرف چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ پچھلے ابواب کے وجودِ خدا پر پیش کردہ دلائل کے بعد، جس میں سوائے اس کی ذاتی رائے کے اور کوئی ٹھوس حقیقت سامنے نہیں آسکی تھی، اگلے باب میں وہ دوبارہ اسی نتیجے کو سامنے لاتا ہے اور انہی سارے قدیم یکساں افراد اور یکساں خیالات کا سہارا لیتا ہے۔

تحلیل و تجزیہ

باب کا آغاز ایک بوئنگ ۷۴۷ طیارے کی مثال سے ہوتا ہے۔ ڈاکنس کو اس کا خیال آتا ہے، مگر پھر فوراً ہی وہ انکار بھی کرتا ہے۔ وہ ان تخلیق کاروں پر برہم ہوتا ہے، جو اس عظیم کائنات کے ڈیزائن پر ایمان رکھتے ہیں۔ خالق اور ڈارونیئیت کے درمیان یہ تصادم نیا نہیں ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے کو احمق اور جاہل کہنا ایک پرانی روایت ہے۔

ایسی مثالیں پیش کر کے ایک فریق خود کو درست ثابت کرتا اور کچھ ٹھوس مثالیں سامنے لا کر بحث ختم کرتا ہے۔ کتاب کے مصنف نے پھر نظریہ ڈارونیئیت کو آگے بڑھایا ہے اور چند بشریاتی، کائناتی اور اثباتی (Yes) نظریات پیش کر کے اپنے مقدمے کو مضبوط کیا ہے۔ دنیائے فلسفہ میں ایسی عقلی توجیہات، جب کوئی فرد ایسے تصورات پیش کرے جن کی بنیاد غیر مصدقہ بیرونی نظریئے، واقعے یا مثال پر قائم ہو، کمزور ترین سمجھی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر باب کو اس نے ''لاادریت، اپنے خواب'' کو مثالی کہہ کر ختم کیا ہے۔

۲.۹۔ باب ''مذہب کی جڑیں''

یہ باب جو بذاتِ خود ایک عمیق فلسفیانہ توجیہ ہے، مگر حیران کن طور پر کوئی فلسفہ

ہی پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کی جگہ بہت سی دیگر سائنسی گفتگو رکھی گئی ہے۔ یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ مذہب کی جڑیں قدیم تاریخ اور خود انسانی جین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس لیے مذہب کی اصل جڑ پکڑنے کی خاطر متعلقہ فرد کو وہیں رک جانا ہوگا جہاں فی الواقع اس کی جڑیں موجود ہیں۔ تاہم زیرِ مطالعہ باب میں ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی!

تحلیل و تجزیہ

اسباب میں ڈاکنس نے چند نفسیاتی نکات پر گفتگو کی ہے، جسے فلسفیانہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن اندرونی طور پر اس نے دراصل ڈارون، اس کے خیالات اور اس کے تجربوں کی گفتگو کی ہے۔ البتہ ایک حقیقت جس کا وہ انکار نہیں کرسکا ہے، یہ ہے کہ مذہب ذہنی دباؤ اور اختلاج کی کمی میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جھنجھلاہٹ میں وہ اسے بھی محض ''طفل تسلی'' ٹھہراتا ہے۔ کچھ بھی ہو مگر مذہب کے فوائد کا انکار کیا ہی نہیں جاسکتا، جس کے سبب معاشرے میں مثبت اور غیر متبادل اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۲.۱۰۔ باب ششم: ''اخلاقیات کی جڑیں۔ ہم اچھے کیوں ہیں؟''

ڈاکنس کے مطابق انسانی اخلاقیات کا سرا بھی ڈارونیئیت سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں وہ انسانی فطرت میں موجود جنسی طلب کی مثال سامنے لاتا ہے جو اس کے مطابق ڈارونیئیت کی جڑوں ہی سے پیوستہ ہے۔ اس کا سوال ہے کہ اگر انسانی جسم کا ایک حصہ ڈارونیئیت کی شہ پر ابھر سکتا ہے تو پھر باقی سارے جسم پر اس اثرات کیوں مرتب نہیں ہوسکتے؟ وہ زور دیتا ہے کہ اگر خدا نہ بھی موجود ہو، تب بھی نیک رہنے کے لوازمات موجود رہتے ہیں۔ چند واقعات پیش کرتے ہوئے اس نے یہاں اول و آخر

دوسرا پروف

کئی مثالیں جمع کی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ باب سماجی مسائل اور سماج کے لیے وقف ہے۔ سارے مسائل جو فطری ہیں! مثلاً یہ کہ اگر خدا نہ ہو تو کوئی کیسے نیک رہ سکتا ہے؟ اور خدا نہ ہو تو کوئی کیوں آخر نیک بنا رہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ اخلاقیات کی جڑیں آخر کہاں پائی جاتی ہیں؟ ڈارون کے خیالات ونظریات میں، یا مذہب میں؟ نیز یہ کہ معاشرہ اور مذہب خود اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

تحلیل وتجزیہ

اخلاقیات کی جڑیں ''ہم اچھے کیوں ہیں؟'' یہ وہ باب ہے جس میں زور دیا گیا ہے کہ ہم اس لیے نیک نہیں ہیں کہ مذہب موجود ہے، لیکن یہ بات کہتے ہوئے منصف بھول جاتا ہے کہ صرف مذہب کے سبب ہی اربوں لوگ نیکی کی طرف راغب ہوتے اور نیک بنے ہوتے ہیں۔ اگر اس مقصد کے لیے دنیاوی قوانین بنائے جاسکتے ہیں کہ انسانوں سے ان کی پابندی کروائی جائے اور خلاف ورزی کی صورت میں ان پر سزا نافذ کی جائے تو پھر مذہب کو بھی ایسی ہدایات جاری کرنے سے کیوں روکا جائے اور آخرت کی شدید ترین سزاؤں سے کیوں خوفزدہ نہ رکھا جائے؟ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اخلاقیات کے لحاظ سے دنیاوی قوانین عموماً خاموش ہیں، لیکن صرف مذہب ہی ہے جو دنیا کے لیے اخلاقی قدروں کا پیکیج بھی سامنے لاتا ہے۔ تاریخی ریکارڈ اور انسانی زندگیوں کے جائزے سے یہ بات ثابت ہے کہ لوگوں میں اخلاقی قدروں کے شعور کا سبب مذہب بنتا ہے نہ کہ ارتقائی تصور! چناں چہ مذہب نہ ہو تو دنیا سے اخلاقی قدریں غائب کیسے ہو جائیں۔ مزید یہ کہ انسان کی جنسی جبلت وخواہش کا کوئی تعلق ڈاروینیت سے بھی ہے۔ اس کا کوئی ''باقاعدہ ثبوت'' اب تک نہیں مل سکا ہے۔

۱۱.۲۔ باب ۷: ''نیکی کی کتاب اور تبدیل ہونے والی اخلاقیات''

اس باب کو ڈاکنس نے عیسائیت اور انجیل پر تنقید کے لیے مختص کیا ہے۔ پیدائشی اور تربیتی لحاظ سے عیسائیت میں بڑے ہونے والے ڈاکنس کا مذہب سے کوئی اچھا واسطہ نہیں رہا۔ نئے اور قدیم عہد ناموں سے اس نے چند غیر اخلاقی آیات اٹھائیں اور ثابت کیا کہ اخلاقیات سے خدا کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی رَو میں اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کی قربانی کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس میں اسلامی قصے بھی شامل کر دیے ہیں۔ (تاکہ ان کا یہ عمل غیر اخلاقی ثابت کیا جاسکے۔ مترجم) باب میں اس کے ملفوظات کا واضح رجحان یہی نظر آ رہا ہے کہ مجموعی طور پر مذہب واہیات، غیر عقلی اور غیر اخلاقی ہوتا ہے۔ آخر میں اس نے چند تازہ ترین مثالیں بھی پیش کی ہیں، جن کا تجزیہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

تحلیل وتجزیہ

سب سے پہلے ہم اس امر کو لیتے ہیں کہ بعض عیسائی عقائد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے۔ آج کے بہت سارے عیسائی اس عقیدے کو ماننے سے سرے سے انکاری ہیں۔ خود انجیل میں بھی یہ بات کہیں درج نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے جسمانی بیٹے تھے اور اس کی خدائی میں شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے عیسائی پروفیسرز اس بیان کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس بجائے ''خدا کا بیٹا'' ہونے کو وہ دراصل ''خدا کا محبوب'' ہونا قرار دیتے ہیں۔ انجیل میں خدا کے بیٹے ہونے کو بعض دوسرے حضرات پر بھی منطبق کیا گیا ہے۔ خدا کے بیٹے یعنی ''خدا کے چہیتے''! اس تشریح سے تثلیث کا نظریہ ہوا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر

مہر مَین روبورغ (Roborgh)[1] ایسی ہی ایک شخصیت ہیں جو خدا کے بیٹا کی یہی تشریح کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انجیل میں بیان کردہ جو غیر اخلاقی متن ہے، اس میں بھی یہ احتیاط لازمی ہے کہ سنجیدہ گفتگو میں محض مستند متن ہی سامنے لانا چاہیے۔ انجیل نے اپنے بارے میں کبھی نہیں کہا کہ وہ خدا کا کلام ہے، بلکہ اس کے بدلے اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا کلام کہا گیا ہے۔ انجیل فی الاصل بعض شخصیات کے بیان کردہ حالات و واقعات کا ایک تاریخی ریکارڈ ہے، جن میں سے بعض نے انہیں غیر محتاط (غیر اخلاقی) طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس لیے ان اضافہ شدہ اقوال و بیانات کی ذمے داری خدا پر عائد نہیں ہوتی۔ جو کچھ بھی انجیل میں ہے۔ اسے سو فیصد خدا کا کلام نہیں کہا جا سکتا۔ مرقس، متی، جان اور لوقا دراصل انہی ذاتی مرتبین کی انجیلیں ہیں نہ کہ خدا کی! اور ان میں کہیں بھی دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ یہ خدائی کلام ہیں۔

ڈاکِنس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ان کے بیٹے کی قربانی کا بھی ذکر چھیڑا ہے، جو کہیں حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں اور کہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام! اس مرحلے پر آیئے ہم ایسی بیوی کی مثال لیں جو اپنے شوہر کی وفاداری و محنت کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ کہہ سکتی ہے کہ یا تو وہ اپنی بچپن کی دوست سے کنارہ کشی اختیار کر لے یا یہ گھر ہی چھوڑ دے۔ وفادار شوہر تو بیوی کی بات مانتے ہوئے اپنی گرل فرینڈ کو چھوڑ دے گا۔ امتحان میں کامیابی کے بعد ممکن ہے کہ بیوی اجازت دے دے کہ اب وہ اپنی دوست کو بھی ساتھ رکھ سکتا ہے۔ میں تو بس تمہاری زندگی میں اپنی محبت کا مقام جانچنا چاہ رہی تھی اور وہ میں نے پالیا ہے۔

اس موقعہ پر شوہر اپنی بیوی سے خوش ہو کر گلے لگ جاتا ہے اور کہانی ختم ہو جاتی

1. Professor of World Religions MUL

ہے۔ کہانی میں آپ کو کوئی قابل اعتراض بات نظر آئی؟ تو اسی کہانی کو آپ حضرات ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے کی قربانی پر بھی منطبق کر لیں۔ خدا بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے احکام کی اطاعت کی شدت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب رضا کارانہ اور جوش اطاعت سے بھرے ہوئے اپنے بیٹے کی قربانی پر راضی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ بھی ان سے راضی ہو گیا اور بیٹے کو ان کے لیے صحیح سلامت چھوڑ دیا۔ اس قصے میں آخر کون سی بات قابل اعتراض ہے؟

مصنف مذکور نے آخر میں یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ قدیم شہر کو برباد کر کے سعودی حکام آخر جدید مکہ تعمیر کرنے میں کیوں مصروف ہیں؟ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ ہوش میں تو ہیں؟ خدا کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ باب زیر مطالعہ میں مصنف نے ایسے ہی واقعات نقل کر کے صحیفوں میں ان کے غیر اخلاقی ہونے کا سوال اٹھایا ہے۔ یہ حقیقت بہت ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آج کی لادینی دنیا اخلاقی لحاظ سے بہت پیچھے ہے۔ اپنے خاندانی استحکام اور اخلاقی قدروں کے لحاظ سے مغرب آج کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ ان کے کاروباری اصول و مفادات کی کارفرمائی محض ذاتی فوائد کی خاطر ہی رہتی ہے۔ لیکن جہاں تک لوگوں کی ذاتی زندگی کا سوال ہے۔ کوئی ہدایت نامہ اور نقشۂ کار موجود نہیں ہے۔ نہیں بھولنا چاہیے کہ مذہبی یا لامذہبی کے سوال سے ہٹ کر کالی بھیڑیں ہر طبقے اور ہر قوم میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے انہیں نمایاں کر کے اپنے دلائل لانا عقل کے خلاف بات ہے۔

١٢.٢۔ باب ٨: ’’مذہبی غلطیاں کیا ہیں؟ وہ اتنا مخالف کیوں ہے؟

حسب روایت یہ باب بھی مذہبی تعلیمات پر نکتہ چینی سے پُر ہے۔ ڈاکِنس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذہبی لوگ صرف بنیاد پرست اور بانجھ ہوتے ہیں۔ اسی رَو میں وہ ہم

جنس فحاشی کو بھی جائز ٹھہرانے کی جسارت کر جاتا ہے جب کہ ہر سامی مذہب اس حرکت کے خلاف نفرت کا فتویٰ دیتا ہے۔مصنف نے یہاں قدیم مسلم تاریخ سے بھی کچھ مثالیں سامنے رکھی ہیں۔ان کی بعض کالی بھیڑوں کی مثالیں دی ہیں اور سب کو اسلامی انتہا پسندی کے ساتھ جوڑا ہے۔اس کوشش سے اس کی خواہش رہی ہے کہ لوگ اس پر تحسین وآفرین بھیجیں۔

تحلیل وتجزیہ

ہمارا اولین سوال یہ ہے کہ اگر مصنف خود کو آزاد خیال (لبرل) کہتا ہے تو اسے لوگوں کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی ضرورت کیا ہے؟ حتیٰ کہ وہ جنسی عمل کے مختلف جسمانی پہلوؤں میں بھی دلچسپی لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جب کہ عیسائی تبلیغی مشنز پر برہمی کا اظہار کرتا ہے۔حالاں کہ ایک تحقیق کے مطابق تبلیغی مشن سب سے زیادہ فرحت بخش ہوتے ہیں۔اس باب میں وہ ایک بار پھر مختلف تہذیبوں پر وار کرتا ہے، حالاں کہ یہ کسی بھی لحاظ سے دانش مندی نہیں ہے کیوں کہ دنیا میں سینکڑوں قسم کی تہذیبیں ہیں اور ان کے اپنے اپنے طور طریقے ہیں۔پھر آخر اس موضوع پر وقت ضائع کرنے کی کیا تک بنتی ہے؟ دوسرے نمبر پر اس نے جنگوں میں فوجوں کے بھیجنے پر نکتہ چینی کی ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی دشمن نے آپ کی سرزمین پر حملہ کر دیا تو ملک کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ آپ اپنی افواج اور عوام کا حوصلہ بلند رکھنے کی بھی ضرورت محسوس کریں گے! مذہب کو ایک منٹ کے لیے الگ رکھ کر آپ بتائیں کہ اس مرحلے پر آپ کی سوچ کیا ہوگی؟ کیا آپ فوج کو میدان جنگ میں اترنے کا حکم دیں گے لیکن ان کی ہمت افزائی کے لیے کچھ بھی نہیں کریں گے؟ یا آپ کا رویہ

اس کے برعکس ہوگا؟ کیا آپ ان سے یہی کہیں کہ ''اگر تم جنگ میں کام آ گئے تو قصہ ختم۔کوئی بھی تمہیں یاد نہیں رکھے گا۔'' یا یہ کہیں گے کہ ''آپ لوگ ہمارے دلوں اور ہماری دعاؤں میں ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے۔'' یقیناً آپ یہ دوسری بات ہی پسند کریں گے۔تو قرآن میں بھی خدا نے اپنے بندوں سے یہی بات کہی ہے۔اور اللہ کا وعدہ تو سب وعدوں ہی سے سچا ہے کہا اللہ نے:

''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں ہرگز مردہ نہ کہو۔وہ زندہ ہیں، مگر تمہیں شعور نہیں۔(۲:۱۵۴)(۲)

مجاہدوں سے اعلیٰ ترین ہستی کی جانب جب اس طرح کا دائمی و پختہ عہد کیا جاتا ہے تو میدان جنگ میں وہ ناقابل یقین معجزے دکھاتے ہیں، جیسا کہ نبی کریم محمد ﷺ کے دور میں مسلمانوں نے اپنے سے دس گنا طاقتور لشکر کو شکست عظیم سے دوچار کیا تھا۔

مصنف نے چند دیگر گمراہ کن اور تاریخ کے غلط حوالوں کے ساتھ ''ابن ورّاق'' پر بھی گفتگو کی ہے۔ان کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے دور سے پہلے تک جنگوں میں بے رحمی وسنگدلی کم ہوئی تھی، اور بعد کے ادوار میں جنون اور خون بہانے کا عمل بہت شدت اختیار کر گیا تھا؟ حقائق واضح کرتے ہیں کہ مکہ کی حتمی فتح کے بعد نبی ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جب اس کا قبضہ حاصل کرنے مکہ روانہ ہوئے تو اس وقت آپ ﷺ کے پاس ہر قسم کا اقتدار تھا۔(واقعے کے فوراً بعد ہی آپ ﷺ کا انتقال ہو گیا تھا) تو آپ ﷺ نے تب کیا سلوک کیا تھا؟ خون کے پیاسے اپنے دشمنوں کو انہوں نے اسی وقت معاف کر دیا تھا اور مکہ شہر مکمل امن و امان کی حالت میں لوٹ آیا تھا۔قرآن میں اللہ تعالیٰ ذکر کرتا ہے کہ ''اللہ کی راہ میں جنگ کروان

لوگوں کے خلاف جو تم سے جنگ کرتے ہیں، لیکن حد سے نہ بڑھو۔ اور حد سے زیادہ بڑھنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔" (۲:۱۹۰) (۲) (یعنی فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کی جانب سے خون خرابے کم ہو گئے تھے۔ مترجم)

اور یہ کہ:

"پھر اگر وہ اپنے ہاتھ روک لیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔" (۴:۹۰) (۴)

اس طرح اللہ نے قرآن میں ایک سنہرا اصول وضع کر دیا کہ تمہیں صرف انہی لوگوں کے خلاف جنگ کی ہدایت ہے جو تم سے جنگ پر خود آمادہ ہوں۔ یعنی ان لوگوں کے خلاف جنگ جو زمین میں فتنہ وفساد برپا کرنے کی نیت رکھتے ہوں۔ اور ان لوگوں کو امان دینا جو تم سے امن کے طلب گار ہوں۔ امن کے طالبوں سے جنگ کرنا سخت ممنوع ہے۔ ایسا نادر قانون جنگی قوانین میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ وحشیانہ شق جنگوں میں حکومتیں اگر محض اسی ایک شق کو سنجیدگی سے نافذ کر دیں تو بے شمار لوگوں کی جانیں محفوظ ہو جائیں۔

اس باب سے ہم مصنف کی دہریاتی عدم برداشت کی نفسیات بھی سمجھ سکتے ہیں اور یہ کہ بنیاد پرستی کے خلاف وہ کس ذہنیت سے پروپیگنڈا کرتا ہے؟ کسی کمپنی میں کوئی ملازم جس طرح اس کمپنی کے تمام قواعد کو تسلیم کرتا اور قاعدے قوانین کی سب سے زیادہ پابندی کرتا ہے تو مذہبی معاملات میں انہی اصولوں کو مسترد کیوں کیا جاتا ہے؟ مذہبی قوانین کی حد سے زیادہ پاسداری کرنے والوں کو بھی اسی طرح وفادار ترین تسلیم کیا جانا چاہیے نہ کہ الٹا انہیں "بنیاد پرست" کہہ کر بدنام کیا جائے! ہم جنس فحاشی کو انسانی تاریخ میں جس طرح کسی بھی مذہبی سلسلے سے تعلق رکھے بغیر، سدا غیر اخلاقی کہہ

کر مسترد کیا جاتا رہا ہے، کہ اس سے انسانی نفسیات پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی طرح مذہب نے بھی اس عمل کو غیر اخلاقی کہہ کر مسترد کیا ہے۔

یہ تینوں ابواب (۸، ۷، ۶) اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ ان سب میں ایک ہی بات اور ایک ہی نظریہ مشترکہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ "سماجی و اخلاقی قدریں کیا ہونی چاہئیں اور معاشرے پر مذہب کے منفی و مثبت اثرات کیا رہے ہیں؟" اس لیے قاری کو بہتر تفہیم و تجزیے کی خاطر ان تینوں ابواب کو یکجا کر کے ایک ساتھ پڑھنا چاہیے۔

۲.۱۳۔ باب ۹ "بچپن، ہراسانی اور مذہب سے فرار"

اپنی پیچیدہ نوعیت کے لحاظ ہی سے اس باب کے تجزیے کی الگ ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ زندگی کے چند حقیقی واقعات کو بنیاد بنا کر ڈاکِسن نے صرف اپنے نظریے ہی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عیسائیت ہو یا اسلام، ہر مذہب، ہر قسم کے جنسی افعال، بچوں کی ہراسانی اور خواتین کے استحصال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یعنی "مرد حاکمیت" کو فروغ دیتا ہے۔ اس سے ڈاکِسن نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔

تحلیل و تجربہ

سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ جس عقیدے پر لوگ قائم رہتے ہیں، ان کے افعال کا اس پر بحیثیت شخص کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یعنی جس طرح کسی فرد کا قانون کی خلاف ورزی کرنا، قانون کے غلط ہونے کا باعث نہیں بنتا، اسی طرح کسی مذہبی کتب کی غلط تعبیر و تشریح اور اپنے اعمال سے خود مذہبی کتاب بھی غلط ثابت نہیں ہوتی۔ کوئی

بھی انسان بذاتِ خود اپنی ذات میں مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے مذہب سے وابستہ افراد سے بھی کامل ترین ہونے کی توقع درست نہیں ہے! کسی ملازم کی ذاتی غلطی سے تو پھر اس کی کمپنی کو بھی بند کر دینا چاہیے۔ اگر آپ مذہبی فرد کی غلطی کی وجہ سے خود مذہب ہی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں، تو پھر ملازم کی غلطی پر آپ کو کمپنی کو بھی بند کر دینا چاہیے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ غلط اور ناجائز اعمال یکسر قابلِ مذمت ہیں، خواہ انہیں کوئی دینی آدمی انجام دے یا لادینی!

۲.۱۴۔ باب ۱۰: ''ایک ضروری خلا''

اس آخری باب کا مضمون بھی وہی ہے، جو گزشتہ باب کا تھا۔ اس لحاظ سے کتاب فی الحقیقت تکرار در تکرار کا مجموعہ ہے۔ وہی نظریات، وہی مثالیں، وہی دلائل اور وہی اندازِ فکر! اس لحاظ سے یہ آخری باب بھی گزشتہ ابواب سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

تحلیل و تجزیہ

ڈاکِسن وضاحت کرتا ہے کہ ایک عام سا عقیدہ ہے کہ لوگوں کے غموں، حادثات، ناانصافیوں اور محرومیوں کے ضمن میں خدا ان کے دماغ کو تسکین پہنچاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عقیدہ بھی رائج الوقت ہے کہ انسانوں میں تمام ہمت اور امیدیں خدا ہی کی جانب سے آتی ہیں، لیکن ایک طرف وہ اس نظریے کو مسترد بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنے موقف کے لیے کوئی دلیل بھی فراہم نہیں کرتا۔ ساری کتاب میں یہی مسئلہ موجود ہے۔ مثلاً کہیں اگر وہ کہتا ہے کہ علمِ فلکیات، خدا کے وجود کی توثیق نہیں کرتا، تو اسے مسترد کر دینے کی خاطر وہ کوئی دلیل بھی نہیں لاتا۔ اس کا کام محض قیاس آرائیاں اور مفروضات ہی پیش کرنا ہیں!

۲.۱۵۔ سائنسی نکتے

جہاں تک کتاب میں پیش کیے گئے سائنسی نکات کا تعلق ہے جو اس میں بہت زیادہ پھیلے ہوئے ہیں، تو وہ بھی چند خاص متعین نکتے ہی تک محدود ہیں۔ یعنی ڈاروینی نظریۂ ارتقاء، نظریہ قدرتی سائنس (قدرتی نشوونما)، آئن اسٹائن کے نظریۂ خدا، اور علم فلکیات کے دلائل! ان نکات کو ایک خاص انداز سے پیش کرنے، ان کا تعارف کروانے، اور ان کا مختصر تجزیہ کرنے کا کام ذیل میں کیا گیا ہے۔

باب اول

یہاں سے ہم اب کتاب کے ایک ایک باب کا سائنسی تجربہ شروع کریں گے۔ پہلے باب میں بہت زیادہ سائنسی نکات پیش نہیں کیے گئے ہیں، سوائے اس کے کہ بعض سائنسدانوں کے اقوال کو نقل کیا گیا ہے، بلکہ اس میں بھی ڈاکِسن یادہ تر البرٹ آئن اسٹائن اور کارل Sagan ہی تک محدود رہا ہے، تاکہ اپنے دہریاتی عقائد کا ثبوت مضبوط کیا جاسکے۔

۲.۱۶۔ سائنسی ثبوتوں کے بدلے سائنسدانوں کے اقوال

ڈاکِسن نے امریکی ماہر ستارہ جات کارل Sagan کے اقوال کو پیش کیا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق اس کا ہم خیال ہے۔ تو چلیں ہم بھی ایک جائزہ لیں کہ اپنے عقائد کے مطابق وہ کیا رائے رکھتا ہے؟ کارل نے کہا ہے کہ:

''میں ایک ''لا اَدری'' فرد ہوں Agnostic (حوالہ Jim Demon, the Haunted World, Minneapolis Star-Tribune,

(March 2,1996۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے عقیدے کا اسے کچھ خود پتہ نہیں
تھا۔ ''لاادری۔ میں نہیں جانتا۔'' اس کے اپنے دہریہ ہونے کا ذکر کرنے کے بجائے
صرف یہ کہا گیا ہے کہ میں لاادریت کا قائل ہوں۔ لاادریت عقیدے کا مالک ہونا، یعنی
وثوق سے معلوم نہ ہونا کہ خدا ہے بھی یا نہیں۔ خدا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی! ایسے افراد کا
کہنا یہ ہوتا ہے کہ انسان صحیح طور پر یقین نہیں کر سکتا کہ اس کا خدا وجود بھی رکھتا ہے یا
نہیں؟ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ چناں چہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے
اپنے مؤقف کی مضبوطی کی خاطر ایک لاادری عقیدے کے حامل فرد کارل Sagan کا
دامن کیوں پکڑا؟ اور اس کی ضرورت ہی اسے کیا تھی؟ دوسری بات یہ کہ ڈاکِسن نے
تحقیقی اصولوں کو روندتے ہوئے کہ سائنسی حقائق کا سہارا لیا جائے، محض سائنسدانوں
کے اقوال کا سہارا لیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ لوگ کسی دھوکے میں لازماً مبتلا ہو جائیں۔

باب دوم

اس باب میں خدا کے مفروضے کا خودساختہ نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ دلائل اور
ثبوت کچھ بھی نہ ہوں، مگر انکارِ خدا کے لیے کہیں نہ کہیں سے کچھ دلائل ضرور سامنے
لائے جائیں! اس مقصد کے لیے اس نے کہیں ''سائنسی'' تجربات پیش کیے ہیں اور
کہیں ''سماجی سائنسی'' تجربات! نتیجہ خدا کے رَد اور موجودگی کے انکار کی صورت میں
نکلتا ہے۔

تجزیہ: ۲.۱۷۔ دعائیں، ارتقا اور NOMA

NOMA تمہارے لیے کیا پیش کرتا ہے؟ ایک ارتقائی سائنسدان سوال کرتا
ہے؟ ''یہ خدا کے عدم وجود کے مفروضے کو سامنے لاتا ہے۔'' سائنسدان خود ہی

وضاحت کرتا ہے۔ ہم آج ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جسے سائنسی دنیا کا درجہ دیا
جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ تمام افراد جو سائنس کے ساتھ گویا چپکے ہوئے ہیں، عین اس
وقت اپنی اس سائنس سے جان چھڑا لیتے ہیں جب ان کے سامنے خدا اور مذہب کا
سوال آتا ہے۔ مثلاً آپ نمازوں اور دعاؤں کا تجربہ لیں۔ انسانوں کے رویوں،
صحت، اور سلامتی سے متعلق بعض اثرات کے حصول و دفع کے لیے یہ ایک نفسیاتی و
حیاتیاتی جز ہے۔ یہ سوال کہ لوگوں پر نمازوں کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟ اُسے بہتر بناتی
ہے؟ حالات ویسے ہی رہتے ہیں؟ یا مزید بگڑ جاتے ہیں؟ اس کے متعلق Centra
اسٹیٹ ہسپتال کا کہنا ہے کہ ''نمازوں اور دعاؤں کے نفسیاتی اثرات، ذہنی پریشانیوں
اور دباؤ کو کم کرنے میں مدد دیتے، امید کی شمع جلاتے اور زندہ رہنے کی امنگ پیدا
کرتے ہیں۔ (حوالہ: وکی پیڈیا)(۶)

لہٰذا سادہ الفاظ میں ہمیں پوچھنا چاہیے کہ کیا ڈاکِسن لوگوں کو مرنے کے لیے
چھوڑنا چاہتے ہیں یا خوشیوں بھری زندگی گذارنے کے لیے جیتے رہنے دینا چاہتے
ہیں؟ اسے چوں کہ انسانوں کی فکر بہت زیادہ ہے، لہٰذا معلوم کرنا ہے کہ پھر کیوں وہ ان
کی زندگیوں سے خدا کو چھین لینا چاہتے اور امیدوں کو مایوسی میں تبدیل کرنا چاہتے
ہیں؟ لوگوں کی زندگیوں سے خدا کو چھین کر، بدلے میں وہ پھر انہیں کیا فراہم کرنا چاہتے
ہیں؟ ڈاکِسن کا آخری نکتہ ڈارونییت ہے اور اس نے خود تسلیم کیا ہے کہ نظریہ ارتقاء کے
مطالعے کے بعد ہی اس نے دہریت کو اختیار کیا تھا۔ نیز ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے
لوگوں کو دہریت کی طرف صحیح معنوں میں پختہ کیا ہے۔ اس دلیل سے خود ہی ثابت ہو رہا
ہے کہ دہریوں اور ڈاکِسن کا عقائدی ڈھانچہ کس قدر کمزور ہے؟ انہوں نے تو اپنے
عقائد کی بنیاد ہی محض نظریے (مفروضے) پر رکھی ہے۔ تو اگر مستقبل میں کبھی یہ مفروضہ

سائنسی بنیادوں پر مسترد ہوا تو پھر ان لوگوں کا کیا بنے گا؟ ہر سال سائنسی نظریات تبدیل ہوتے اور تحقیقی مقالہ جات بے حیثیت ہوتے رہتے ہیں۔ تو اگر کبھی ڈارون کا نظریہ غلط قرار دیا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ سائنس دان بھی اکثر ایک دوسرے کے نظریات کو بے بنیاد ٹھہراتے رہتے ہیں۔ تو اگر کوئی دوسرا سائنس دان ڈاکسن کے مفروضات کو بھی مسترد کر دے تو؟ اس دوران جس قدر لوگوں کا وقت اُس (مصنف) نے دہریت کے فلسفے میں ضائع کیا ہوگا، کیا اس تمام دورانیے کو وہ واپس لے آئے گا؟ یا کیا وہ جہنم میں جانے والے لوگوں کی ذمے داری قبول کرلے گا؟ فیصلے کے دن کیا وہ تمام ذمے داری اپنے سر پر لینے کو تیار ہے؟

باب سوم

خدا کے وجود پر دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے، وہ اس باب میں مختلف پیرائے کا اظہار کرتا ہے۔ تخلیقِ کائنات و انسان کی انجیلی روایات پیش کرتے ہوئے وہ حیرت انگیز طور پر قرآن کا نام بھی نہیں لیتا۔ تخلیقی مفکرین کے بھی وہ محض اچٹتے ہوئے دلائل ہی سامنے لاتا اور ساتھ ہی مسترد بھی کرتا ہے۔ بہرحال اس باب کو ہمیں کتاب کا مرکزی حصہ ہی قرار دینا چاہیے۔

تحلیل و تجزیہ ۳

۲.۱۸۔ تخلیقی صفات اور مقدس کتب

باب میں مصنف نے وجودِ خدا کے خلاف کائنات سے گواہیاں لائی ہیں۔ لیکن دلائل کو مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ براہ راست مابعد الطبیعاتی دلائل کے حصے میں منتقل ہوجاتا ہے تاکہ دینی ذہن رکھنے والوں کی شخصیت اور عقائد کا تجزیہ کرسکے۔ لہٰذا اس

ضمن میں پہلا سوال تو یہی اٹھتا ہے کہ بطور خاص وہ خدا کی تخلیق اور مذہبی دلائل کے روشن پہلو کیوں سامنے نہیں لایا؟ ظاہر ہے کہ اس طرح اسے دہریت کا اپنا نظریہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہوگا۔ کوئی بتائے کہ اس طرزِ عمل کو کیا نام دیا جائے؟ علمی بددیانتی؟ پھر صحیفہ جاتی دلائل جو تخلیقی عمل کے بارے میں پائے جاتے ہیں، ان کے بارے میں بھی غیر سائنسی طرز اختیار کرتے ہوئے یہاں ایک ایسی دستاویز کا حوالہ دیا گیا ہے جسے اس دستاویز کے مصنف کی تحریر مانی ہی نہیں جاتی۔ یہی صورت حال انجیلی کتب کی ہے، جنہیں بہت بعد میں خدا نے نہیں، بلکہ دوسرے لوگوں نے مرتب کیا تھا۔ عہد نامہ قدیم و عہد نامہ جدید، دونوں! ہاں البتہ جس کتاب کو اس کے اصل مصنف اللہ کے نام سے جانا جاتا ہے، یعنی قرآن! اس کا ذکر تک بھی اس نے گوارا نہیں کیا۔ ممکنہ طور پر علمی شکست کے خوف سے۔

باب چہارم

تو پھر سوال یہی آن کھڑا ہوتا ہے کہ خدا کیوں نہیں ہے؟ اس باب میں سوال کو درست ثابت کرنے کی خاطر ڈاکسن اہم سائنسی اصطلاحات کا استعمال کرتے ہوئے اپنے دلائل کو تین پہلوؤں کے گرد گھماتا ہے۔ ارتقاء، فلکیات اور بشریات۔ اپنے ملحدانہ فلسفوں کی تقویت کے لیے اس نے کچھ حوالے جنیٹیکس کے اور کچھ حوالے تاریخ کے بھی دیے ہیں۔

تحلیل و تجزیہ: ۲.۱۹۔ حیاتی سائنس

ڈاکسن نے اس باب میں بھی ارتقائی و فلکیاتی نکات اٹھائے ہیں۔ (اس پر پہلے ہی بات کی جاچکی ہے)۔ تاہم حیاتیاتی پہلو کچھ نیا ہے۔ پہلی بات تو ہے کہ DNA اور RNA مرکب حقائق ہیں جو اپنے اندر حیات کے بارے میں اہم انکشافات رکھتے

ہیں۔اس میں ماں کے رحم سے لے کر موت تک، زندگی کے ہر تقاضے کی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اس کے جنس اور کروموسومز کسی بھی نسل کے اندر یا باہر سے ظاہر ہونے والے، تمام حالات کو جنم دینے کے ذمے دار ہیں۔ کروموسوم کی خدا کی نہ حمایت کرتا ہے اور نہ مسترد کرتا ہے، جیسا کہ ڈاکسن نے طنزیہ طور پر بیان کیا ہے، بلکہ خدا تو ان چیزوں کو انتہائی باریک بینی سے خود ہی تیار کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ خلیے پیدائش کے وقت اپنی تقسیم در تقسیم کے عمل کو کیسے جان لیتے ہیں؟ سب سے پہلے والے انسان میں یہ ساری اطلاعات انسان بننے سے پہلے ہی (رحم مادر میں) کیسے پہنچ جاتی ہیں؟ اور کیسے ہر ہر معلومات بالآخر ٹھیک اپنے اپنے ہی مقام پر جا پہنچتی ہے؟ حتیٰ کہ خدائی تخلیق کے یہ نمونے جین کے اندر اور باہر بھی جنم لیتے ہیں۔ اس قسم کی ایک مثال ڈاکٹر Nathanid T Jeanson اور Jeffrey P. Tomkins اور اس کے جینیاتی نمونے ہیں۔ یہاں ہم علم بشریات اور علوم سماجی سائنس پر بات ختم کرتے ہوئے (تفصیل بعد میں دی جائے گی)، کہنا چاہیں گے کہ اچانک ظہور پذیر ہونے والا کوئی واقعہ، سائنسی عمل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، جب تک کہ وہ اسی طرح کا کوئی عمل نہ بن جائے، جیسے نیوٹن کے سر پر سیب گرا تھا۔ سیب تو گرتے ہی رہتے ہیں، لیکن اُس ایک گرے ہوئے سیب نے نیوٹن کو قانون ثقل دریافت کر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

باب پنجم

یہاں ڈاکسن نے مذہبی بنیادوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جن بنیادوں کی طرف اس نے اشارہ کیا ہے۔ عمومی طور پر وہ نفسیاتی فطرت ہیں۔ ڈاکسن نے اس

باب میں بھی عمل ارتقاء پر دوبارہ زور دیا اور تھوڑا بہت علم حیاتیات کو بھی چھیڑا ہے اور انہیں ڈارونیئیت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مذہب لوگوں کے خوف کا فائدہ اٹھاتا ہے، انہیں ثواب کا لالچ دیتا ہے اور لوگوں کی نفسیات سے کھیلتا ہے۔

تحلیل وتجزیہ: ۲.۲۰۔ نفسیات اور مذہب

باب کی ابتدا میں ڈاکسن زور دیتا ہے کہ انسانی حیاتیات میں مذہب سماتا ہی نہیں ہے، لیکن دوسری ہی سانس میں اس کی تضاد بیانی سامنے آجاتی ہے کہ مذہب انسان کے کمزور اور جذباتی اعضاء پر حملے کرتا ہے، لہٰذا اس موقع پر ہمیں ''جزا'' کی نفسیات پر بھی گفتگو کر لینی چاہیے۔ جزا دراصل انسان میں قوت بھر دینے کے کام آتی ہے۔ (۲) قوت سے مراد اچھے صِلوں کے حصول کی خاطر نیک اعمال کرنے کی سعی کرتا ہے۔ چناں چہ خدا اگر انسانی نفسیات کے مطابق کوئی ہدایت دیتا ہے تو ڈاکسن کو اس سے کیا مسئلہ، کیا پریشانی درپیش ہے؟ اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ خدا انسانی نفسیات کے خلاف کام کرے؟ انسان کو صرف سزائیں ہی دیتا رہے اور بھلائی کے کاموں کی ترغیب دینے سے دور رہے؟ پھر وہ ملکی قوانین کے بارے میں کیا رائے رکھے گا؟ ملکی قوانین بھی تو یہی کرتے ہیں کہ خلاف ورزی پر سزا کا خوف دلاتے اور پاسداری کی جانب حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تو کیا ریاست بھی یہاں (خدا کی مانند۔ مترجم) انسانی نفسیات ہی سے کھیل رہی ہے؟ اگر ملکی قوانین جزا وسزا، آپ کے حساب سے درست ہیں تو پھر خدا کے قوانین پر جزا وسزا کو بھی درست ہی ہونا چاہیے۔ نفسیاتی سائنس کا یہ طریقہ کار بالکل درست ہے۔

2. Vupsy.nl>reward

باب ششم

اس باب میں اگرچہ اخلاقیاتی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، لیکن اول تا آخر کسی بھی قال ذکر سائنسی نکتے پر گفتگو موجود نہیں ہے۔ اخلاقی پہلو کو تو بلکہ سماجی سائنس کے زمرے میں بیان کرنا چاہیے۔ بہرحال! سوال اٹھایا گیا ہے کہ اخلاقیات کی جڑیں آیا خدائی ہیں یا ڈارونی؟ زور دیا گیا ہے کہ نیکیاں اور اچھے اخلاق تب بھی ہو سکتے ہیں جب کہ خدا موجود نہ ہو۔

تحلیل وتجزیہ: ۲.۲۱۔ سماجی سائنس

ورلڈ اکنامک فورم نے ایک تحقیق پیش کی تھی کہ ''یہ سوال خود دہریوں کا مسئلہ بھی ہے جو اپنی تہذیب کے رسم ورواج پر زیادہ بحث کرتے ہیں (اور جو بہت زیادہ مذہبی جذبوں کا مظہر ہوتے ہیں)۔ لیکن دہریاتی نظریے کے لوگ انہیں کبھی مذہب سے نہیں جوڑتے۔ اس لیے یہ کہنا کہ مذہب اخلاقیات پر اثر انداز نہیں ہوتا درست نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقیات مذہب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔'' (۳)

یوں مذکورہ تحقیق نے مذہب اور اخلاق، اور مذہب وثقافت کے باہمی طور پر اثر انداز ہونے کی تصدیق کی ہے۔ مثال کے طور پر اسلام نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ کوئی لڑکی اپنے لیے کسی شوہر کا انتخاب کرے (جیسا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتخاب کیا تھا)۔ لیکن یہاں برصغیر میں اس آزادی کو ایک برا فعل گردانا جاتا ہے۔ (اسلام کے اس اصول کی وکالت یہاں ادھوری ہے۔ رشتے کے انتخاب میں لڑکی کو آزادی تو دی گئی ہے، لیکن نوجوان لڑکی کے ولی یا سرپرست کی تائید

3. www.weeforum.org>religion-does-not-determine-your-morality

کو بھی شرط قرار دیا گیا ہے۔ اگر یوں آزادانہ انتخاب کا راستہ کھول دیا جاتا تو فحاشی و بے حیائی کے دروازے بھی خود ہی کھل جاتے۔ زیر نظر تجزیئے میں ایک ہی مثال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی پیش کی گئی ہے، جو عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کافی بڑی (۴۰ سال کی) تھیں، نہ کہ کم عمر دوشیزہ! مترجم)

اس طرح یہاں ہم نے دیکھا کہ ثقافت نے مذہب پر غلبہ پالیا۔ (غلط یا صحیح، ایک دوسرا پہلو ہے)۔

لہٰذا ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں اور جدید تحقیق بھی اس کی تصدیق کرتی ہے کہ تمام اخلاقیات کی جڑ مذہب ہی ہے۔ البتہ کبھی کبھی ان اخلاقی اطوار پر تہذیب و ثقافت کا بھی غلبہ ہو جاتا ہے۔

باب ہفتم

اس باب میں اخلاقیات کا جائزہ انجیلی کتب کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ اگرچہ ٹھوس سائنسی حقائق پیش کرنے سے یہاں بھی گریز کیا گیا ہے۔ نیز اس موضوع کو بھی سماجی سائنس کے عنوان سے پیش کیا جانا چاہیے تھا۔

سماجی سائنس بھی ایک سائنس ہے۔ اس لیے اسے بھی سائنسی انداز سے پیش کرنا چاہیے تھا۔ ان واقعات کو تجرباتی سائنس کے تحت بھی زیر بحث لانا چاہیے تھا، لیکن ڈاکسن نے اس کے خلاف عمل کیا ہے۔

تحلیل وتجزیہ: ۲.۲۲۔ سماجی سائنسی منظرنامہ

مصنف نے یہاں بھی بعض غیر اخلاقی انجیلی مواد پیش کیا ہے۔ اس بارے میں سوال یہ ہے کہ آخر کن بنیادوں پر اس نے انہیں اخلاق سے گرا ہوا بتایا ہے؟ غیر اخلاقی

سونے کا فیصلہ کس نے کیا تھا؟ آپ کو اس امر پر اتفاق کرنا ہوگا کہ اگر یہ ساری باتیں غیر اخلاقی ہیں تو مذہبی لحاظ سے ہیں کسی اور وجہ سے نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بائبل کے اقتباسات، متعلقہ انجیلی کتب سے غلط طور پر موسوم کیے گئے ہیں، ورنہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مذہبی لحاظ و اخلاق سے گرے ہوئے ہوں۔

ایک بات اگر طے ہو جائے کہ انجیلی حوالوں سے جو بھی گرا ہوا مواد نکالا جاتا ہے، اسے مذہب اور خدا سے جوڑ دیا جاتا ہے، تو پھر ان معاملات پر سوائے دہریت کے جنون کے، پر خوش ہونے کی اور وجہ کیا ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس پر مصنف نے تحقیقی طور پر کچھ لکھنے سے گریز کیا ہے۔

ایک سوال مزید پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی پہلو مذہبی لحاظ سے غیر اخلاقی ہے تو بہت سارے معاملات دہریت کے لحاظ سے بھی تو غیر اخلاقی ہونی چاہئیں۔ لہٰذا ناگریز ہے کہ ان کا ایک جائزہ مذہبی لحاظ سے بھی لیا جائے۔

باب ۸

اس باب میں سماجی سائنس کا ایک اور پہلو، اخلاقیات کا اٹھایا گیا ہے، جسے انتہا پسندی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس اہم نکتے کے باوجود، کہ دہریت یا لادینیئت میں اخلاقیات کے کوئی مسلمہ اصول نہیں ہیں۔ ڈاکِسن نے ان پر طویل گفتگو کی ہے اور مطلق نہیں سوچا کہ جو تنقید وہ اس لحاظ سے کر رہا ہے، وہ بھی سراسر مذہبی نقطہ نظر ہے، کیوں کہ وہ اخلاقیات کا سب سے پہلا مخالف مذہب ہی کو قرار دیتا ہے۔ معاشرے کا کوئی بھی برا پہلو لے لیں اور اسے مذہب کے ساتھ جوڑ دیں۔ (اس کا اصول یہی ٹھہرا ہے۔ مترجم)

تحلیل و تجزیہ: ۲.۲۳۔ سماجی سائنس ایک بار پھر!

یہاں ایک اور معاملہ بھی درپیش ہوا، جس کا احساس ڈاکِسن کو بھی نہیں ہو سکا۔ بھول گیا کہ جس سماجی معاملے پر وہ انگلی اٹھا رہا ہے، اس سے مذہب از خود ہی نمایاں ہوتا ہے۔ ''یہ معاملات، خراب یا گندے کیوں ہیں؟ اس لیے کہ مذہب نے انہیں گندا کیا ہے!'' سو شکریہ ڈاکِسن تمہارا کہ تمہارے دلائل کی وجہ سے مذہب کی اہمیت مزید بڑھی، لوگوں کے ذہنوں سے غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ اور اس بارے میں ان کا ذہن صاف ہوا۔ ڈاکِسن کا کہنا ہے کہ مذہب ہر بات کا دشمن کا ہے۔ ہاں دشمن ہے لیکن انتہا پسندی کا دشمن! مذہبی کوئی بھی ہدایت، انتہا پسندی کو فروغ نہیں دیتی، بلکہ اس لیے ہوتی ہے کہ لوگ مذہب سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اگر کوئی سائنسدان اپنے سائنسی تجربے میں ناکام ہو جائے تو اس کا الزام کس پر جائے گا؟ سائنس پر یا سائنسدان پر؟

باب ۹

کتاب کے اس آخری حصے میں زندگی کے بعض حقیقی واقعات شامل کیے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ افراد میں موجود کالی بھیڑوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ بذات خود یہ طریقہ غیر سائنسی اور غیر تحقیقی ہے کہ انسانوں کے گروہ سے محض خراب واقعات چنے جائیں اور خوبصورت واقعات کو دور پرے رکھا جائے۔ دنیا میں آج ۶ ارب ۹۰ کروڑ مذہبی رجحان والے لوگ بستے ہیں، لیکن ڈاکِسن نے اس کے برعکس محض کچھ ہی خراب، لوگوں کو ہدف بنایا ہے جب کہ تمام نیک نفس لوگوں کو نظرانداز کیا ہے۔ کیوں اُس نے مذہبی طبقوں کی خوبصورت و عمدہ صفات کا بیان دلائل میں شامل نہیں کیا؟ ویسے ہی جیسے اس نے دہریئے لوگوں کی بعض اچھی خصوصیات کا ذکر کیا تھا!

تحلیل و تجربہ: ۲.۲۴ جنسی رویے

مذہب نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر جیسے پر روشنی ڈالی ہے۔اسی طرح اس نے جنسی زندگی پر بھی گفتگو کی ہے۔ ڈاکسن جیسے لوگ جب اس بارے میں مذہب کی ہدایات پر منفی تجزیئے پیش کرتے ہیں تو انہیں یاد نہیں رہتا کہ اس پر ذرا گہرا مذہبی مطالعہ کرلیا جائے۔زندگی کا لازمی حصہ جنسیات بھی ہے اور ہر نسل کشی کرنے والی مخلوق کا لازمی و ناگزیر حصہ ہے۔صرف یہی نہیں کہ اس سے ایک نیا وجود جنم میں آتا ہے بلکہ اس عمل سے ایک لطف بھی نصیب ہوتا ہے۔اور اسی لطف وجہ سے لوگ اس عمل کو جاری رکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ورنہ زمین میں زندگی اور نسلیں کچھ ہی مدت میں ختم ہوچکی ہوتیں۔مختلف تہذیبوں اور مذاہب میں جنسیات اور جنسی زندگی پر مختلف تعلیمات ملتی ہیں جو انسانی زندگی کا بالکل ذاتی معاملہ ہے۔ہمارا سوال یہ ہے کہ ڈاکسن کو کسی کے ذاتی کمروں میں جھانکنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خواب گاہوں میں جاکر وہ کیوں دیکھنا چاہتا ہے کہ جوڑے کیا کررہے ہیں اور کیسے کررہے ہیں؟ یہاں تک کہ وہ رحم خواتین میں بھی جھانک کر دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے کہ اندر کیا ہورہا ہے؟ کوئی فرد جنسی طور پر جب کوئی برا کام کرتا، بدکاری کرتا، اور ورغلاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ یہ عمل کس مقام پر کررہا ہے؟ گرجا میں، مسجد میں، صومعے میں یا مندر میں، تو نہیں بھولنا چاہیے کہ مذہب اس کی نہ صرف مذمت کرتا ہے بلکہ سزائیں بھی نافذ کرتا ہے۔حتیٰ کہ حدود تک کی سزائیں بھی!۔اسی کے ساتھ کریہہ جرم کے خلاف ملکی قانون کو بھی حرکت میں آنا چاہیے۔ڈاکسن نے مذہبی مقامات پر اس عمل کو ہوتے ہوئے دیکھا تو بڑا کام کیا، لیکن کیا اس نے کبھی مختلف نائٹ کلبز میں بدکاریاں ہوتے

ہوئے نہیں دیکھیں؟ بتایئے تو سہی کہ ان نائٹ کلبز میں کون سی مذہبی کتب پڑھائی جاتی ہیں؟ پھر مے کدوں میں کتنے پادری شراب پلانے پر مامور ہوتے ہیں؟ نائٹ کلبز میں ہر روز زنا اور بدکاری کی، بھاری اور شراب میں دھت، جو کارروائیاں ہوتی ہیں، ان پر تو وہ زبان بند رکھتا ہے اور عبادت گاہوں میں کبھی اتفاقیہ ایسے کریہہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔تو ان پر اظہار کرنے سے نہیں چوکتا۔اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے زنا اور تشدد سے خواتین کو بچانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن اس سے ضرورت دلچسپی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مذہب کو بدنام کیا جائے؟ اس سے اسے شاید ذاتی تسکین حاصل ہوتی ہے۔

باب ۱۰

کتاب کا یہ باب آخری ہے، اور توقع کی جارہی تھی کہ اس میں گزشتہ تمام ابواب کا نچوڑ بیان کیا جائے گا، مگر ہوا اس کے برعکس۔اس کے بجائے اس نے ایک بار پھر نفسیاتی مسائل کو اٹھایا ہے۔کتاب کے خاتمے کے بجائے اس میں اس نے ایک بار پھر کئی نئے سوالات کھڑے کردیے ہیں! اصولاً تو مصنف کو یہاں حتمی تجربہ، حتمی نتائج اور تحقیق کا خلاصہ بھی بیان کرنا چاہیے تھا، جسے صرف خدائی واہمے پر اختتام پذیر ہونا چاہیے تھا، لیکن اس کے بدلے اس نے صرف ان نکات پر توجہ مرکوز رکھی کہ خدا لوگوں کو جزا اور انعام کیوں دیتا ہے؟

تجزیہ: ۲.۲۵۔نفسیات، دوبارہ

اگر خدا کا وجود ہے اور بالفرض ہم یہاں بھی لیں کہ ڈاکسن نے یہ حقیقت قبول کرلی ہے، تو کیا پھر خدا کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ نیک بندوں کی تعریف کرے اور ان

کے عمدہ کاموں کا اچھا صلہ دے؟ لہٰذا سوال خدا کے موجود ہونے کا ہے۔ پھر خود ہی اقرار کرنا پڑے گا کہ انسان کوئی بھی عمل کرے، خدا اسے اچھے کاموں کا اچھا صلہ، اور برے کاموں کا برا صلہ ضرور دے! لوگ خدا پر ایمان اسی لیے رکھتے ہیں کہ اُس سے انہیں اپنے اچھے اعمال کی بہترین جزا ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو اور خدا کسی کو کوئی جزا ہی نہ دے تو کیا یہ دنیا رہنے کے لیے ایک غیر منصفانہ مقام نہ بن جائے گی؟ جزا اور انعام کے اسی صلے سے تو لوگوں میں کام کو عمدہ طریقے سے انجام دینے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ بدکاری سے بچیں، چوری سے رکیں، خون نہ بہائیں، اور اپنے تمام افعال کا اچھا نتیجہ دیں۔ چناں چہ آخر میں یہ سوال ایک بار پھر تازہ ہوتا ہے کہ آیا خدا ہے یا نہیں؟ بعد کے سارے سوالات دراصل اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں ڈاکِسن کو اسی پر مرکوز رہنا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے برعکس اس نے الٹا خدا کے ہونے ہی پر تجزیے پیش کر دیے، اور چوں کہ وہ ایسا نہیں کر سکا، اس لیے خدا حسب دستور بہت ہی اعلیٰ، شاندار اور ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مذکورہ تمام ابواب کے سائنسی نکات کے خلاصے کو ذیل میں ایک بار پھر دہرایا جاتا ہے۔

۲.۲۶۔ کیا اخلاقیات غیر روحانی معاملہ ہیں؟

روحانیت سے الگ ہو کر اخلاقیات کی حیثیت ہی کیا ہے؟ اگر آپ کے اخلاقیات کا کوئی دائمی صلہ نہیں ہے تو پھر اس اخلاقیات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ خدا پر تصور کے بغیر اخلاق کس کام کے؟ اصولِ اخلاقیات آخر کس نے طے کیے ہیں؟ اس کے ''ایس او پیز'' کیا ہیں؟ انہیں کس نے ایجاد کیا؟ اور کب کیا؟ ہاں

ہم جانتے ہیں کہ اخلاقیات کے اصول خدا تعالیٰ ہی نے طے کیے ہیں۔ انسانوں کے طے کردہ اصولِ اخلاقیات (اچھے یا برے) اگر ایک طرف رکھ دیے جائیں تو پھر ان کی بنیادی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔ خصوصاً اُس کے لیے جو خود کو خدائی اخلاقیات کا پابند ہی نہیں سمجھتا۔ جیسے کوئی شخص اگر آپ پر مسلسل نظر رکھے ہوئے ہو، تو اگلے ہی لمحے اسے جرم کرنے سے روکنے والی کون سی چیز ہوگی؟ تصور کریں کہ کوئی شخص جنگل میں ہو جہاں کوئی بھی شخص اسے دیکھنے والا نہ ہو۔ تو کیا وہ شخص وہاں جنگل کا قانون نافذ کرتے ہوئے کسی کو جان سے نہ مار دے گا یا کسی عورت سے زنا بالجبر کا ارتکاب نہ کر لے گا؟ کیا یہ عمل آپ کی نظر میں جچتا ہے؟ اگر نہیں تو گھورنے والے شخص کو جرم کرنے والے کو پکڑنے سے آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ بس یہی وہ صورتحال ہے جہاں روحانیت کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ اور یہ روحانی پابندیاں آپ کو وہاں بھی روک دیتی ہیں، جہاں آپ کو کوئی دیکھنے اور سننے والا نہ ہو! آپ خوف محسوس کریں گے کسی ایسی انجانی عظیم ہستی کا، جو اس کامل تنہا اور باسہولت ماحول میں بھی آپ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ روحانی اخلاقیات سدا متحرک رہتی ہیں چاہے آپ کہیں بھی جائیں۔ اور صرف اسی کی مدد سے آپ ایک شریف انسان بنتے ہوئے نظر آئیں گے۔

۲.۲۷۔ آئن اسٹائن کا نظریہ خدا

ڈاکِسن اپنے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں جمع کرتا نظر آتا ہے۔ ٹوکری جو آئن اسٹائن کی ہے! اس کے خدائی نظریے کو پیش کرتے ہوئے مصنف نے اپنی پوری قوت سے اس کا دفاع کیا ہے۔ آئن اسٹائن کے اصل نظریات کیا ہیں؟ محض سائنسی Relativity ہی کے نہیں بلکہ مذہبی بھی ہیں؟ ایک بڑا سوال۔! ڈاکِسن کوئی

ماہر مذہبیات نہیں ہے۔ چناں ڈاکِسن اخلاقیات میں جس طرح زور دیتا ہے، اسی طرح
آئن اسٹائن کا اصل میدان طبیعات بھی تھا، لہٰذا آئن اسٹائن جیسے سائنسدان کے
نظریاتِ مذاہب کو بس اس کا ذاتی خیال ہی سمجھا جائے گا۔ ڈاکِسن نے جس زوروشور
سے اس کے مذہبی نظریات کو پیش کیا ہے، اس سے لگتا ہے جیسے وہ خطاؤں سے بالکل
پاک فرد تھا۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ مذہبیات کو بھی چھوڑ دیجیے اور محض اس کے
سائنسی نظریات پر بات کیجیے۔ اس کے سائنسی نظریات و خیالات بشمول نظریہ
Relativity کو بھی جدید سائنس دانوں Mark Buchanan اور Staurt
Clark نے مسترد کیا ہے۔(۷) مزید برآں عالمی NAC سوسائٹی نے بھی مسلمہ
دلائل کے ساتھ اسے مسترد کیا ہے۔(۸) لہٰذا، ایسا فرد جس کے کام پر اسی کے میدان
کی اہم شخصیات نے سخت نکتہ چینی کی ہو، اس کے خیالات کو کسی اور اہم شعبے کے
بارے میں وثوق کے ساتھ کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً شعبہ مذہب میں تو ضرور!

۲.۲۸۔ علم کائنات

فلکیات کے بارے میں جو دلائل ڈاکِسن سامنے لے کر آیا ہے۔ اسی سے پتہ
چلتا ہے کہ اس نے انہیں اپنے دہریائی عقائد کے مضبوط سہارے نمبر ۲ کے طور پر
پیش کیا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ جب وہ اوپر آسمانوں پر اور کہکشاؤں پر نظر ڈالتا
ہے تو وہاں اسے نہ کوئی خدا نظر آتا ہے اور نہ کوئی بڑی منصوبہ بندی! اس لحاظ سے
ڈاکِسن کسی عظیم تخلیق کار کے وجود ہی کا منکر ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پھر وہ الٰہی تخلیقی
حقائق کو پوری شدومد سے مسترد ہی کرے گا۔ مگر آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے
بارے میں تمام سامی مذاہب متفق ہیں اور بہت تفصیل کے ساتھ اس پر دلائل بھی

دیے ہیں۔ واہمہٗ خدا کے بارے میں مصنف نے جو کچھ بھی دلائل پیش کیے ہیں۔
وہ محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ بنیادی نکتے کو تو اس نے چھوا بھی نہیں ہے،
جیسا کہ نظریہ یہ ہے کہ مادے کی نہ تخلیق کی جاسکتی اور نہ اسے برباد کیا جاسکتا ہے،
بلکہ وہ صرف اپنی شکلیں ہی تبدیل کرتا ہے، تو پھر یہ ابتدائی سحابیہ Nelbula
کہاں سے آیا؟ اس بنیادی سوال کے جواب سے زیرِ نظر کتاب میں یکسر صرف نظر کیا
گیا ہے۔ کسی نظریئے کی اصل ہی جب محض تخمینے اور مفروضے ہوں، تو وہ نظریہ بعد
میں بھی دلائل پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔ لہٰذا مصنف کو اگر خدائی تخلیقی نظریئے
سے اختلاف ہے تو پھر اسے اس کا کوئی متبادل نظریہ ونقشہ کار پیش بھی کرنا چاہیے تھا
جس کے تحت ہم کائنات کے وجود میں آنے کی حقیقت جان سکتے! ایسا تو ہرگز بھی
نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ صرف دوسرے لوگوں کے مسلمہ خیالات ہی پر انحصار کر کے
رہ جائے۔ اس کے بغیر تو حقیقت صرف یہی باقی ہے کہ ساری کائنات خدا حکم پر ہی
وجود پائی تھی۔ دہریت کے مدعی کے پاس جواب دینے کے لیے پھر کچھ بھی باقی
نہیں بچتا۔

۲.۲۹۔ چارلس ڈارون، اس کا نظریہ ارتقا، اور پس منظر

چارلس ڈارون (وفات ۱۸۸۲ء) میں بائیولوجسٹ (ماہر حیاتیات) نے حیاتی
مخلوق میں زندہ رہ جانے کے انتخاب کا تصور پیش کیا تھا اور وہیں سے اس نے مخلوقات
میں پہلی بار ''سفرِ ارتقا'' کا خاکہ بھی اخذ کیا تھا۔ اس وقت کی دنیا میں اس نظریے نے
بہت توجہ حاصل کی اور لوگ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ (اس قسم کی تمام تحریکیں اپنی
اصل میں خدا سے جان چھڑانے والی ہوتی ہیں۔ مترجم) انہی متاثرہ لوگوں میں سے

ایک یہ صاحب کتاب بھی ہے اور اسی باعث اس نے کتاب God Delusion
تصنیف کی، جس انداز میں اس میں یہ نظریہ سامنے لایا گیا ہے، توجہ کا مرکز وہی انداز
ہے، کیوں کہ مصنف نے اسے اس طرح پیش کیا ہے، جیسے یہ کوئی محض نظریہ (خیال)
نہیں، بلکہ ٹھوس حقیقت ہے۔

یاد رہے کہ مجموعی طور پر نظریۂ ارتقا کا منکر، مذہب بھی نہیں ہے۔ لیکن اصل
اعتراضات اس کی تفصیل میں ہیں۔ ہر سامی مذہب میں کہا گیا ہے کہ انسانی پیدائش
ایک خدائی عمل ہے، جس کے تحت اس نے سب سے پہلے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے
پیدا کیا۔ یہ نکتہ پہلے بھی عرض کیا گیا تھا، اور اب بھی پیش کیا جارہا ہے کہ مفروضے کی
خاطر اگر ہم ارتقا کے بارے میں تمام دلائل سے اتفاق کر بھی لیں، تب بھی یہ کہنا کیسے
ممکن ہے کہ خدا نہیں ہے؟

بالفرض اگر حقیقت یہی تسلیم کر لی جائے کہ انسان بھی ارتقائی عمل طے کرتے
کرتے رفتہ رفتہ اپنی اس اصل شکل میں آیا ہے۔ تب بھی بہت حقیر مخلوق سے بہت
اعلیٰ مخلوق تک، یک خلیے سے کثیر الخلیات تک، بیکٹیریا سے مچھلی، اور پھر اس سے
آگے اور آگے حتیٰ انسان تک، تب بھی ان تمام مراحل طے کرواتے ہوئے ہم ایک
مرکزی خالق (خدا) کا انکار کیسے کر سکتے ہیں؟ صرف یہ ایک جملہ ہی تمام سوالوں کا
جواب ہے کہ ہر ارتقائی درجے تک پہنچنے کے عمل کی اجازت بھی اسی خدا نے دی تھی۔
ڈاکِسن اور دیگر سائنسدانوں کی لامذہبیت اور انکارِ خدا کو علیحدہ رکھ دیں، تب بھی مذکورہ
جملے (بیان) کو حق الیقین کے ساتھ وہ کیسے جھٹلا سکتے ہیں؟ عمل ارتقا کی کون سے کڑی
خود کو وجودِ خدا سے لاتعلق کر سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آسان راستہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا
اقرار کر لیا جائے!

۲.۳۰۔ تضادات

کتاب کے تضادات ’’کا تاثر واہمۂ خدا‘‘ ہی سے جنم لیتا ہے۔ کتاب کا عنوان
خود ہی بتا رہا ہے کہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو اس کے بہت ٹھوس دلائل بھی ہونے
چاہئیں۔ لیکن کتاب میں اس کے برعکس تمام تر زور اس بات پر ہے کہ خصوصی طور پر،
مذہب کے ماننے والوں کے اعمال میں بہت کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اگر کہیں خدا
کے عدم وجود پر سائنسی دلائل لائے بھی گئے ہیں، تو وہ نظریۂ تخلیق سے بالکل بھی آگے
نہیں بڑھ سکے ہیں، حالاں کہ خدا صرف تخلیقی امور ہی تک محدود نہیں ہے۔ خدا
دراصل ایک ایسی مافوق الخیال ہستی کا نام ہے جو کائنات میں ہونے والے تمام حیران
کن اعمال وافعال کی ذمے دار ہے، لہٰذا اگر کوئی فرد اس طرح کے چند معاملات سے
واقفیت حاصل کر بھی لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ کہاں سے نکل آیا کہ ہر کام میں خدائی
ہاتھ کی موجودگی ایک بے بنیاد بات ہے؟ وہ دو نکات جن کے گرد یہ کتاب گھومتی ہے
اور جن پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ عقل و دانش کے لحاظ سے کمزور ترین ہیں۔ دانش
مندانہ اعتراضات، کیا کسی مباحثے کے تمام امکانات پر محیط نہیں ہوتے؟ لہٰذا محض
نظریہ ارتقا کی بنیاد پر ڈاکِسن خدائی وجود کے امکان کو کیسے رد کر سکتا ہے، حالاں کہ
تینوں بڑے مذاہب اس کے وجود پر سختی سے ایمان رکھتے ہیں!

ڈاکِسن نے پوری کتاب میں خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے امکان پر بات ہی
نہیں کی۔ دوسری جانب اس نے نظریہ ارتقا کو اس نے تمام تر انہی تینوں مذاہب کے
واقعاتِ تخلیق کے اندر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر وہ سامی مذاہب کا مخالف
ہی نظر آتا تھا، اس لیے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ایک حدیث کا حوالہ
دیتے ہوئے کہ شروع میں ان کا قد ۶۰ ہاتھ اونچا تھا (۹) لیکن اب چوں کہ انسان

صرف ۶ فٹ کا ہے، وہ واضح کرتا ہے کہ عمل ارتقا ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے، مگر اپنی اصل میں یہاں بھی ایک تضاد پایا جاتا ہے، کیوں کہ ڈاکسن نے ارتقا کے بارے میں مذہبی نقطہ نظر کے موقف کو فی الاصل چھوا بھی نہیں ہے اور نہ اس نے کسی مذہبی سائنسدان یا مذہبی عالم کی کوئی ایک رائے بھی قارئین کے سامنے رکھی ہے۔ خدا کے عدم وجود پر تمام دلائل اس نے بس دہریوں ہی سے لیے ہیں۔ دہریاتی دلائل بھی کہیں نہ کہیں جا کے موافقت میں آسکتے تھے۔ اگر کہیں وہ عقلی بنیاد پر ہوتے اور مخالف نقطہ ہائے نظر کے دونوں ہی پہلو سامنے آتے۔ لہٰذا اگر انداز فکر ہی درست نہ ہو اور مصنف ہر قسم کا فیصلہ کرنے کے لیے خود ہی منصف بن کر بیٹھ جائے تو معاملہ شک وشبہے ہی کا رہتا ہے۔ ہاں اگر یہ خامی دور کر لی جائے اور خدا کے بارے میں متضاد نظریوں کی جانچ کے لیے دونوں طرف کے محققین موجود ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ سائنسی فلسفوں اور مباحثوں میں متضاد نقطہ نظر ہائے نظر کا متوازن انتظام بہترین راستہ ہے۔

۱۳.۲ـ خلاصہ

کتاب کے مطالعے میں جو تصور سامنے آتا ہے، وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ اس میں مصنف کسی مستند سائنسی و تحقیقی طریقہ کار اور غیر متعصّبانہ نقطۂ نظر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مصنف کا ذہن چوں کہ خدا کا مخالف ہے، اس لیے اس نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی طریقے سے خدا کی غیر موجودگی کو ثابت کیا جائے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے اس نے خدا کے نہ ہونے کے خلاف ہر قسم کے کمزور اور غیر ضروری مآخذ کو حاصل کیا ہے، خواہ وہ کتنا ہی غیر منطقی کیوں نہ ہو! پھر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ بس یہی کہتا نظر آتا ہے کہ ”دیکھا! خدا کہیں بھی موجود نہیں ہے۔“ کئی سماجی مسائل کو

شہادت کے طور پر پیش کرتے اور مذاہب کی کمزوریوں کو بنیاد بناتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ”خدا نہیں ہے۔“ دوسری طرف لامذہب معاشروں کی کمزوریوں اور مذہبی شخصیات کے اقوال کو پیش کرنا وہ جان بوجھ کر بھول جاتا۔ اور ایک نامکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی ملزم کو صفائی کا موقع نہ دیا جائے اور جرم کا سارا ملبہ اسی پر ڈال دیا جائے۔

حوالہ جات

1. Dawkins, R (2006) God Dolusion, The Preface, Great Britan: Bantam Press.
2. Al Quran, Surah Al Baqarah, Chapter, verse 154 (Sahih International)
3. Al Quran, Surrah Al Baqarah,2, Chapter 2. Verse 190 (Sahih Intunatinal)
4. Al Quran, Surah, Al Nisa, Chapter 4,Verse 90, (Sahih Internationl)
5. Dawson J (1996) The Demon-Haunted World, Minnea polis.
6. En. Wikipedia.org>psychological-benefits-of-Prayer.
7. http://www.newscientist.com/article/mg200269801-500-why-einsstein-was-wrong-about-relativity/N.full stay.
8. Challenge to the Special theory of relativity.NAC Society, Published on Physics Essay.
9. Sahih Al Bukhari, Hadith No. 246/2020

باب سوم

۳.۱۔ ارتقا اور اس کی تاریخ

ارتقا کو سادہ طریقے سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''ہر زندہ مخلوق کی صلاحیت کہ اپنی موجودہ حیثیت کو تبدیل کر سکے اور آگے نئی نسل میں منتقل کر سکے، اور جس کے مرحلے میں کوئی تبدیلی سامنے آتی رہے۔''

وقوع پذیر ہونے والی ان تبدیلیوں کو ''تبدیلی'' ((Mutation اور مراحل تبدیلی کو ارتقا Evolution کہتے ہیں۔ اس تصور کو سب سے پہلے فرانسیسی ماہر حیاتیات Jean Baptiste Lamarck نے 19ویں صدی میں پیش کیا تھا۔(۱) اگرچہ اس کی پیش کردہ تفصیلات میں بعض خامیاں تھیں، لیکن اولین طور پر اسی نے اس نظریے کو پیش کیا تھا۔

بعد ازاں دو برطانوی ماہرین حیات ''الفرڈ رسل'' اور ''چارلس ڈارون'' منظر عام پر آئے۔ جنہوں نے ''انتخاب فطری'' کی بنیاد پر اس نظریے کو باقاعدہ طور پر پیش کیا۔(۲) دونوں نے اپنے اپنے خیالات الگ الگ پیش کیے تھے جس میں ''فطری انتخاب'' کے مرحلے میں خصوصیات کی منتقلی پر کئی اضافے بھی کیے اور حیاتیات کے میدان میں میں ایک نئے نظریے اور تصور کا اضافہ بھی کیا۔ لیکن اصل اہمیت ڈارون کے خیالا کو حاصل ہوئی اور جلد ہی مقبولیت بھی حاصل ہوگئی، کیوں کہ اس نے اس بارے میں کچھ خاص نوٹس الگ سے بھی لکھے تھے۔ بتایا تھا کہ جگہ جگہ سفر کرتے ہوئے اسے حیاتیات میں بعض تبدیلیاں ہوتی ہوئی نظر آئی تھیں جسے اس نے اگلے مرحلے کا فطری انتخاب سمجھا تھا اور اندازہ ہوا تھا کہ اس انتخاب کے باعث ہی یہ

تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ڈارون کے مطابق بعض جانور مثلاً سانپ، جن کے ابتدا میں ہاتھ اور پیر بھی ہوتے تھے، ماحول کے مطابق بہتر زندگی کے لیے بعد میں آہستہ آہستہ ان کے ہاتھ اور پیر غائب ہوتے چلے گئے۔ زرافے، اس کے نزدیک پہلے چھوٹی گردن رکھتے تھے، لیکن تبدیلیٔ وقت کے ساتھ ان کی گردنیں لمبی ہوتی چلی گئیں تاکہ اپنے ماحول میں بہتر طور پر ڈھل سکیں۔ پھر وہیں اس نے ''موزوں ترین کا زندہ رہنا'' (Surviaval of The Fittest) کا نظریہ پیش کیا، جس کے مطابق ''جو زندگی سب سے زیادہ ماحول کے مطابق ہوگی، جینے کا حق صرف اسی کو ہوگا۔ باقی کمزور مخلوقات مٹ جائیں گی۔'' اس مقصد کے لیے مختلف مخلوقات ماحول کے مطابق گذارا کرنے کے لیے اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرتی رہتی ہیں۔ اور اسی سعیٔ مسلسل کو ارتقا کہتے ہیں۔

اپنے نظریے کو پختہ کرنے کے لیے اس نے انکشاف کیا کہ انسان بھی بن مانسوں سے تبدیل ہوتے ہوتے اس شکل تک پہنچے ہیں۔ ارتقا اپنی اصل میں ایک بہت سست مرحلہ ہے۔ اس قدر سست کہ محض ایک سادہ اور معمولی مگر مکمل تبدیلی کے لیے بھی لاکھوں سال لگ جاتے ہیں۔ بن مانسوں سے اصل انسان بنتے بنتے بھی اسے لاکھوں لاکھ سال لگ گئے۔ مگر اس ضمن میں کوئی ٹھوس ثبوت اور دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کی بجائے اس نے محض ماحولیات اور آثارِ قدیمہ کی وضاحتوں ہی پر اکتفا کیا۔ آثارِ قدیمہ Archeological میں اس نے پتھر دور کے وحشی و اکھڑ انسان کے فوسلز کو پیش کیا جو بن مانس اور انسان کے درمیان کی کڑی تھے۔ لیکن الجھن اس وقت پیش آتی ہے کہ انسان آج بھی موجود ہیں اور بن مانس بھی! لیکن وہ درمیانی مخلوق Fossils کہاں چلے گئے؟ عین ممکن ہے کہ درمیانی مخلوق کے یہ آثار

(Fossils) کسی اور ہی فنا شدہ مخلوق کے ہوں، جنہیں غلطی سے اس نے پتھری دور کے اکھڑی انسانی آثار قرار دے لیا ہو۔

بہرحال ڈارون کے تصورات کو بہت زیادہ راہ ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈارون کے ماننے والے ڈارون سے بھی زیادہ ''ڈارونی'' ثابت ہونے لگے۔ مذکورہ ''پُرلطف'' بیان ثابت کرتا ہے کہ ڈارون خود بھی اپنے موقف پر اتنا راسخ نہیں تھا۔ بلکہ کہیں کہیں تو وہ اپنے بیانیے میں فکری انتشار کا شکار بھی نظر آتا ہے۔ یعنی وہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ اس کا موقف واقعی درست بھی ہے یا نہیں؟ لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے ماننے والے اس کے نظریے پر اس سے بھی زیادہ مضبوط اور ڈارون سے بھی زیادہ ڈارون بننے لگے۔ ڈاکِسن بھی انہی میں سے ایک شخص ہے جسے ہم نے اس کے کتاب God Delusion میں پایا۔ ڈارون کے خیالات تا حال محض ایک نظریہ ہی ہیں، لیکن مصنف نے اس سے حتمی نتیجہ نکال لیا کہ یہ خیال ایک بالکل ٹھوس حقیقت ہے۔ ڈارون نے تو پھر بھی اپنے کچھ سفری تجربے بیان کیے تھے، لیکن ڈاکِسن نے تو مرحلہ جاتی وحیاتیاتی تبدیلی کا کوئی بھی تجربہ پیش نہیں کیا۔

۲.۳۔ کیا مذاہب، ارتقا کا انکار کرتے ہیں؟

یہاں ایک بڑا سوال سامنے آتا ہے کہ کیا مذاہب، عملِ ارتقا کے منکر ہیں؟ یا یہ کہ کون سا مذہب اس کا اقرار کرتا اور کون سا اس کو رد کرتا ہے؟ جواب بہت سادہ سا ہے۔ سامی مذاہب اس نظریے کے حامی ہیں، جس طرح ارتقا کی تفصیل میں کہیں کہیں سائنسدانوں کے اختلافات موجود ہیں، اسی طرح ارتقا کے بارے میں مذہبی شخصیات میں بھی بعض مقامات پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب ہر قسم کے ارتقا کے کلی طور پر حامی بھی نہیں اور کلی طور پر مخالف بھی نہیں ہیں۔

ا۔ یہودیت

۱۹ویں صدی میں نظریہ ارتقا کے باقاعدہ آغاز کے بعد قدامت پسند اور اصلاح پسند دونوں ہی طرح کے یہودیوں نے اسے ایک سائنسی حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ ان کے مطابق توراتی کتاب ''پیدائش'' دراصل ''تخلیق'' کے ہم معنی ہی ہے۔ بعد میں اس باب کی کئی آیات کو مزید ارتقا سے بھی جوڑ دیا گیا تھا، جس کے باعث باب پیدائش کی جدید اور سائنسی تشریح بھی شروع کر دی گئی، بلکہ پوری تورات ہی جدید سائنسی انداز سے کی جانے لگے (حالاں کہ باب ''پیدائش'' کی ٹھوس سائنسی غلطیاں، آج کے سائنس دان نکالتے ہی رہتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ یہ باب کلی طور پر غیر سائنسی ہے۔ Analysts کے مصنف ڈاکٹر عمر فاروق سعید کا بیان اس لحاظ سے محل نظر ہے۔ مترجم)

اس موضوع پر جن سائنسدانوں نے بہت تفصیل سے لکھا ہے، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

* Nathan Aviezer In the Begining, Bibilical Creation: and Science, Fossila and Faith, Understanding Torah and Science.
* Aryeh Carmell and Cryill Domb. ed:challenge: Torah Views on Science and Its Problems.
* Daniel E. Friedmann. The Genesis one code: Demonstrates a Clear alignment between the times of Key Events described in the Genosis with those derived from scientific observation. And the Broken Gift: Harmonizing the Bibilical and Scientific accounts

of Human Oriogins.
* Aryeh Kapka Immorality, Resurrection and the Age: of the iniverse: A Kahblistic View.
* Yahud Levi Toroh and Science: Their Interplay: in the World Scheme.
* Jonathan Sacks The Great Partnership: God, Science and the Searach for Meaning.
* Gerald Schroeder Genesis and the Big Bang:
* The Discovery of Harmony Between Modern Science and the Bible: The Science of God.
* Natan Slifkin. The Challenge of Creation.

۲۔ عیسائیت

''میں ایک ارتقائی ماہر حیاتیات Biologist ہوں اور عیسائی ہوں۔'' یہ الفاظ اسٹین فورڈ کے پروفیسر Joon Roughgarden نے اپنی کتاب Evolution Charistian Faith Reflections of and Evolutionary Biologist (۴) میں پیش کیے ہیں اسی کی مانند دیگر عیسائی مثلاً Grey نے بھی توثیق کی ہے کہ اپنے مقاصد کو عیاں کرنے کی خاطر خدا نے الٰہیاتی طور پر ارتقائی حیاتیاتی مراحل کا بندوبست کیا ہے۔ (۵) مبشراتی عیسائی مبلّغ Denis R Alexander لکھتا ہے کہ یہ سائنسدان کا کام ہے کہ ارتقاء اور مذہب کے درمیان تعلق کو تلاش کریں۔ مذہب نے تو اس نظریئے کو پہلے ہی بیان کر دیا ہے۔ سائنس کا کام ہے کہ وہ ارتقا اور مذہب کے درمیان یا تو تعلق کو واضح کرے یا کسی درمیانی خلا کو دریافت کرے اور دونوں کے درمیان کسی منظم تعلق کو قائم کرے۔

۳۔اسلام

یہ بات بہت واضح ہے کہ اسلام میں ارتقا کا وجود پایا جاتا ہے۔ایک فرمان نبوی ﷺ کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اپنی پیدائش کے وقت ساٹھ ہاتھ لمبے تھے۔ (۶) جب کہ آج کا انسان زیادہ سے زیادہ چھ فٹ کا ہے۔اس لحاظ سے ترقیاتی عمل کا ثبوت اسلام سے مل جاتا ہے۔(محض ایک ہی حدیث ہے، کسی قرآنی آیت سے نہیں۔حوالۂ بخاری کے باوجود عقلی طور پر ساٹھ فٹ کا طویل آدمی اپنی زندگی میں قدم قدم پر مصیبتوں، اذیتوں اور مسائل کا شکار رہے گا۔یوں بھی حضرت آدم علیہ السلام کے بعد آدم علیہ السلام ثانی جنہیں حضرت نوح علیہ السلام کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ساٹھ فٹ کا انسان اچانک چھ فٹ میں کیسے تبدیل ہو گیا، جب کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی ﷺ تک ہر نبی کا اجمالاً یا تفصیلاً بیان ہمیں قرآن و حدیث ہر جگہ ملتا ہے؟ حتیٰ کہ مسجد اقصیٰ میں نبی کریم ﷺ کی تمام انبیاء کی امامت اور ساتوں آسمان پر تمام انبیاء علیہ السلام سے ملاقات کا نسبتاً تفصیلی بیان آپ ﷺ سے ثابت بھی ہے۔ممکن نہیں ہے کہ آپ ﷺ سفر معراج کی تمام تر باریکیاں بیان کریں اور انبیاء کرام علیہ السلام کے قد کا ذکر بھول جائیں؟ بخاری کی سند کے باوجود حدیث آدم علیہ السلام پر سوالات سامنے آتے ہیں۔مترجم)

مزید برآں دیگر مسلم دانشور مثلاً ''دانیال حقیقت جو'' (Daniel Haqiqat jou) (۷) بھی ارتقائی عمل کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔اس موضوع پر انہوں نے ایک مقالہ بعنوان Can Islam Object to Evolution (کیا اسلام ارتقائی عمل پر اعتراض اٹھا سکتا ہے؟'' لکھا ہے۔(۸)

لہٰذا ارتقا پر اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔وہ اس کی تردید نہیں کرتا۔حتیٰ کہ

اہم ترین حدیث بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔(مصنف کا اپنا نقطہ نظر۔یوں تورات و انجیل بھی اصلی نہیں بلکہ ترمیم و اضافہ شدہ ہیں۔مترجم)

اس بحث سے نتیجہ یہی سامنے آتا ہے کہ تینوں سامی مذاہب اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں، بلکہ بعض مخصوص مقام پر تو وہ اس کی تائید میں بھی نظر آتے ہیں۔اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نظریے کو ہر مذاہب کے تعلیمی اداروں میں تسلسل سے پڑھایا جارہا ہے، جس میں اسلامی ممالک بھی شامل ہیں۔(اپنی بات کی تائید میں مسلم ممالک کے تعلیمی اداروں میں نظریہ ارتقا کا مسلسل پڑھایا جانا، آیا اسلامی فقہے اور نظریئے کی تائید بن سکتا ہے۔یہ نتیجہ نکالنا ایک سوال ہی ہے۔مترجم) چناں چہ اس بنیاد پر مذاہب پر انگلیاں اٹھانا ڈاکِسن ہی کا حصہ بنتا ہے۔وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ چوں کہ ارتقا کا عمل باقاعدہ ہوتا رہتا ہے۔اس لیے خدا موجود ہی نہیں ہے؟ غور کی بات ہے کہ بعض مقامات پر ماہرین ارتقا بھی باہمی اختلاف کرتے ہیں۔لہٰذا اسی طرح مذہب بھی بعض مقامات پر اس سے اختلاف کرتا ہے، لیکن جب مذہب اس طریقۂ عمل سے تخلیق زندگی کی تصدیق کرتا ہے۔تو ڈاکِسن کہیں خدا کا انکار اور کہیں اس کا اقرار کیسے کر سکتا ہے؟

خدا پر ایمان رکھنے سے ڈاکِسن کو پھر مسئلہ کیا درپیش ہے؟ شاید خدا کے نام ہی سے اسے الرجی ہے۔اگر ایسا ہے تو اسلام میں اللہ کے ۹۹ نام ہیں تو وہ ان میں اسے کسی دوسرے نام سے پکار لے۔

۳.۳۔حیاتیاتی لحاظ سے ارتقا کا مطلب؟

چوں کہ حیاتیاتی تخلیق کا عمل جاری رہتا ہے، خواہ جنسی عمل کے باعث یا جرثوموں کے طبی مصنوعی ملاپ کے باعث! اس کے بعد پیدائشی حیات میں ماحولیاتی اور

جینیٹک لحاظ سے تبدیلی ہونے لگتی ہے، جسے طبی اصطلاح میں ''میوٹیشن'' کہتے ہیں۔ یہ جینیاتی تبدیلی ایک قدرتی مرحلہ اور معمول کا عمل کہلاتا ہے اور کبھی کبھی ایک معمولی سی ''تبدیلئ ہیئت'' کے لیے بھی ہزاروں سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ دوسرے لحاظ سے یہ ''میوٹیشن''، نسل میں ایک بچے سے دوسرے بچے میں سامنے آتی ہے۔ مثلاً آنکھوں کے رنگ اور بالوں کی ساخت وغیرہ۔ لیکن وہ تبدیلیاں جو ماحول کی شدت اور رہائش وٹھکانے کی تبدیلی کے باعث رونما ہوتی ہیں، انہیں ایسی خصوصیت کہا جاتا ہے کہ وہ ''موزوں ترین زندگی کی بقا کے لیے درست ہیں'' یعنی Survival of the Fittest ہیں۔

ڈارون نے اسی نظریئے کو اپنے نقطہ نظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق جنگل کے جانور بھی اردگرد کے ماحول کی سختی کو جھیلتے اور رہائش میں مشکل محسوس کرتے ہیں، لہٰذا آہستہ آہستہ ان میں تبدیلیاں جنم لینے لگتی اور وقوع پذیر ہونے لگتی ہیں جو ان کی حیات کو آسان بنا دیتی ہیں۔ ایسی مثالوں میں ڈارون کے مطابق خصوصاً زرافہ، سانپ، بن مانس، مچھلی اور کئی قسم کے پرندے ہیں۔ اس نے زور دیا کہ ماحول سے مطابقت اور آسان زندگی کی خاطر ہی کئی جانوروں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی ہیئت تبدیلی کی ہے اور جو ایسا نہیں کر سکے وہ بالآخر مٹ گئے۔ (مثلاً ڈائنوسار!)۔ اس طرح کئی پرندوں نے بھی جنگل کی زندگی کی سہولت اور رسائی خوراک کی خاطر اپنے پروں اور چونچوں کو بڑھا لیا تھا۔ لیکن بات وہاں جا کر خراب ہوئی جب ڈارون نے انسانوں کے لیے بھی یہی نظریہ قائم کر لیا۔ یعنی انسان بھی اپنی اصل شکل چمپینزی سے تبدیل ہو کر آج ''انسان بن سکا ہے۔'' یہیں آ کر اس کے خیالات تنقید کی زد میں آنا شروع ہوئے۔

مذاہب قرار دیتے ہیں کہ انسان (آدم علیہ السلام) کو خدا نے خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور اسے آدم علیہ السلام کے نام سے موسوم کیا۔ (تورات کے مطابق آدم کا مطلب مٹی ہے۔ مترجم) ڈارون کے اسی انسانی نظریئے نے مذہبی طبقوں کی پیشانیوں پر بل ڈال دیے، جب کہ چارلس ڈارون خود بھی ایک عملی عیسائی خاندان کا فرد تھا۔ اعتراض مذہبی حلقوں کا ایک بڑا یہ تھا کہ محض چند جزائر کے سفر سے اس نے اتنا بڑا نظریہ کیسے قائم کر لیا؟ تنقید کا آغاز ۱۹ ویں صدی میں اس خیال کے منظر عام پر آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ سائنسی اہمیت کے پیش نظر اس بڑے دعوے کے معقول سائنسی دلائل اور ٹھوس ثبوت سامنے آنے چاہیے تھے۔ اب اس دور تک چوں کہ سائنس بہت زیادہ آگے جا چکی ہے، اس لیے اس کے دعوے کے رَد میں مزید ٹھوس اعتراضات بھی سامنے آ چکے ہیں۔ تاہم ڈارون کے دور تک سائنس بہت محدود تھی، اس لیے اس بارے میں وہ کوئی معقول اور ٹھوس سائنسی دلائل سامنے نہیں لا سکا تھا۔ اسی باعث اس کے اور مذہبی حلقوں کے درمیان کشاکش جنم لیتی رہی۔ ان کا اعتراض معقول تھا کہ اگر انسان بن مانسوں ہی سے ترقی کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا نے نہیں بنایا ہے، اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ خدا ہے ہی نہیں، اور یہ کہ مذہب کا بھی کوئی وجود نہیں۔ لیکن جوں جوں سائنس آگے بڑھتی رہی اور انسان بھی اسی طرح رفتہ رفتہ اپنی شکلیں بدلتا رہا، تو معلوم ہوا کہ اس نظریے سے خدا کی عدم موجودگی ثابت نہیں ہوتی! یوں آہستہ آہستہ مذہب اور سائنسدانوں میں مفاہمت بڑھنے لگی اور مذہبی علماء قرار دینے لگے کہ ایک صحیح اور درست ہیئت پانے میں بھی خدا کی مصلحت موجود ہوتی ہے۔ (ڈاکٹر عمر فاروق سعید نے مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے یکساں طور پر اسلام کو بھی شامل گفتگو رکھا ہے۔ حالاں کہ مسلم علماء ودانشوران نے اس

نظریئے سے آج تک اتفاق نہیں کیا ہے۔ مترجم) مذاہب عالم اس معاملے میں نرم پڑ گئے کہ اس خیال کو یکسر مسترد یا یکسر قابل قبول کیسے سمجھا جائے؟ اگر سائنس بن مانسوں کی ذہانت کا ذکر کرتی ہے تو مذہب، سائنس سے بہت کچھ ٹھوس دلائل بھی طلب کرتا ہے۔ یہ دلائل مختلف مرحلوں کے ڈھانچے یا حالات و ماحول کے نمونے بھی ہوسکتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ معاملہ جھگڑے سے بڑھ کر اب ایک معقول علمی مباحثہ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ مذہب اور سائنس میں ڈاکنز کے نظریئے کے خلاف کوئی تصادم نہیں ہے۔

۴.۳۔ڈھانچوں (Fossils) کی داستان

مزید، ڈھانچوں کے مباحثوں کی بھی ایک طویل داستان ہے۔ سائنسدان زور دیتے ہیں کہ درمیانی ڈھانچے بھی پائے جاتے ہیں جن سے انسان کا ارتقائی عمل سامنے آتا ہے۔ ایسے ڈھانچے سامنے آئے ہیں کہ انسان کسی اور مخلوق سے تبدیل ہوکر ہی موجودہ شکل میں نہیں آیا ہے۔ صورت حال کا تجزیہ کرنے کے لیے یہ بات طے ہے کہ ارتقائی عمل کے ماننے والوں میں تجربات کے باعث عمل ارتقا ثابت ہے۔

تاہم درمیانی مرحلوں کے تمام ڈھانچے فی زمانہ دستیاب نہیں ہیں۔ سائنس دان قرار دیتے ہیں کہ غیر معمولی صفات وشکل کی درمیانی خصوصیات تو موجود ہیں، مگر کوئی اصلی ڈھانچہ موجود نہیں ہے۔ اگر ان کے مطابق مینڈک بننے تک مچھلی کو کم از کم بھی چار بار کی تبدیلیوں سے گزرنا پڑا تھا، تو افسوس ہے کہ کسی بھی درمیانی مرحلے کا کوئی ڈھانچہ یہاں نہیں پایا جاتا۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ خرگوش کی ہیئت پانے کے لیے چھپکلی کو بھی تین مناسب مراحل سے گذرنا پڑا تھا، لیکن کسی ایک مرحلے کا ڈھانچہ بھی اس

معاملے میں موجود نہیں ہے۔ اسی باعث سائنس دانوں نے مثلاً ''نیم مگرمچھ، نیم مچھلی'' کی اصطلاحیں ایجاد کیں کہ ایسی مخلوقات کبھی موجود بھی رہی ہیں، لیکن افسوس کہ ان شکلوں کے بھی کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں لائے گئے۔

اس کے برعکس ارتقاء کے ''خلاف'' کئی ڈھانچے Fossils موجود ہیں۔ تخلیقی ذہن رکھنے والوں (مذہبی لوگوں) نے ڈارون نظریئے کے خلاف کئی ٹھوس ثبوت پیش کیے۔ ڈاروینیوں کے مطابق وہیل مچھلی، ہاتھی، تتلی، چیونٹیاں، پودے، گھاس، انسان اور مچھلیاں، ان سب کے آباء و اجداد ایک ہی تھے۔ بعض ڈھانچوں کے تازہ ترین تجزیئے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پتھری دور کے انسان کے آثار درحقیقت homo eructus skulls کے آثار تھے۔ ایک انسانی نسل جو آج بھی پائی جاتی ہے۔ چناں چہ یہ آثار خواہ ایک ارب سال پرانے ہوں یا موجودہ دور کی شکلیں، ڈھانچوں کے ریکارڈ سے جینیاتی ارتقاء کا کوئی ثبوت تا حال دریافت نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے برعکس البتہ انہی ڈھانچوں کے ریکارڈ سے ''تخلیقی'' نظریئے کے افراد کی حمایت میں بہت سارے ثبوت حاصل ہوئے ہیں۔ ان کی ایک فہرست ذیل میں دی گئی ہے۔

رچرڈ ڈاکنس کی کتاب ''خدا کا واہمہ'' کا فلسفیانہ وسائنسی تجزیہ

	Name of Specie	Time-Location	Fossil Record
1	Mushroom	100 million Year-Myanmar	No Change
2	Ant Lion	100 million Year-Myanmar	No Change

3	Scorpion Fly	100 million Year-Myanmar	No Change
4	Marsh Beetle	50 million Year-Poland	No Change
5	Snail Shell	100 million Year-Myanmar	No Change
6	Flutter Fly	50 million Year-Poland	No Change
7	Reptilian Foot	100 million Year-Myanmar	No Change
8	Dwarf Six-eyed Spider	50 million Year-Poland	No Change
9	False Flower Beetle	50 million Year-Poland	No Change
10	Bee Fly	50 million Year-Poland	No Change
11	Turkey Gnat	50 million Year-Poland	No Change
12	Hyena Skull	73 million Year-China	No Change
13	Lynx Skull	65 million Year-China	No Change
14	Jacal Skull	51 million Year-Taiwan	No Change
15	Leopard Skull	73 million Year-China	No Change
16	Zebra Skull	45 million Year-China	No Change
17	Reccoon Skull	43 million Year-China	No Change
18	Monkey Skull	32 million Year-China	No Change
19	Fish Marten Skull	78 million Year-China	No Change
20	Cheetah Skull	73 million Year-China	No Change

21	Tasmanian Devil Skull	32 million Year-China	No Change
22	Tuttle	98 million Year-China	No Change
23	Polar Bear Skull	74 million Year-China	No Change
24	Ash Leaf	23.5 million Year-Spain	No Change
25	Araucarian Cone	178 million Year-Argentina	No Change
26	Juniper Leaf	5.8 million Year-Bulgaria	No Change
27	Apple Leaf	50 million Year-Canada	No Change
28	Cherry Laurel Leaf	50 million Year-Canada	No Change
29	File fish	4 million Year-Italy	No Change
30	Octopus	95 million Year-Labanon	No Change
31	Sea Horse	50 million Year-Italy	No Change
32	Kill Fish	3 million Year-USA	No Change
33	Squirrel Fish	50 million Year-Italy	No Change
34	Wolf Herring	95 million Year-Labanon	No Change
35	Shrimp	150 million Year-Germany	No Change

مندرجہ بالا تمام قسم کی حیات کے ڈھانچوں، جو ۱۷۰ ملین سال سے ۳ ملین سال تک پھیلے ہوئے ہیں، اور آج کی مخلوقات تک، ان کے قد، شکل، اور ساخت کے اعتبار سے سائنسدانوں نے بہت گہری نظر سے جائزہ لیا ہے اور دریافت کیا ہے کہ ماضی کے کئی لاکھ سالوں سے تا حال کسی بھی زندہ مخلوق میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی

دیکھنے کو نہیں ملی، جس کی بنیاد پر واقعی کہا جا سکے کہ ان میں ارتقائی مراحل کے آثار پائے جاتے ہیں۔ خود آپ نے بھی دیکھا کہ اوپر کے نقشے میں سائنس دانوں نے مختلف قسم کی زندہ مخلوق، پودوں سے کیڑوں تک، اور سمندری حیات سے جنگلی جانوروں تک کا معائنہ کیا تھا۔

ایک اور قابلِ ذکر نکتہ اس تحقیق میں یہ بھی سامنے آیا کہ خطرے سے سب سے زیادہ دوچار بلکہ یکسر معدوم ہو جانے کے خطرے سے دوچار جانور مثلاً قطبی ریچھ اور تیندوے، آج بھی حسبِ دستور موجود ہیں۔ اب جب کہ خطرے سے دوچار ہونے والے یہ جانور کسی ارتقائی عمل سے نہیں گذرے (ڈھانچوں کے تفصیلی مشاہدے کے باعث) تو آخر وہ جانور کسی ارتقائی عمل سے کیسے گذرے تھے جو اپنے اردگرد موجود ماحول سے بالکل تسلی بخش رہے ہیں؟ ایک مطالبہ جو ''بقا، موزوں ترین کے لیے'' کے ماننے والے ڈارون کے نزدیک لازمی ہے؟ ایک اور دلچسپ حقیقت یہ بھی سامنے آئی کہ بندر جو انسانوں سے مشابہ ہے، آج بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہے اور کسی بھی ارتقائی مرحلے سے نہیں گذر رہا ہے۔ حالاں کہ لاکھوں سال کے سفر کے بعد اب تو اسے بندر کے بجائے انسان کی شکل میں موجود ہونا چاہیے تھا۔

مزید یہ کہ غیر جانبدارانہ طور پر یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ اس نظریئے کے بارے میں زیادہ تر مطالعہ چین میں کیا گیا ہے جو بذاتِ خود ایک ''لا ادری'' (ملحد) ملک ہے۔ اس لیے مہذب کے بارے میں ان کا منکرانہ رویہ تو سمجھ میں آتا ہے۔ مندرجہ بالا تمام مطالعے اور تحقیق آن لائن بھی دیکھی جا سکتی ہے، جن میں سے ایک واسطہ یہ ہے۔

http://m.harunyayal.com/tr/Books/4006/Atlas-of-Creation_Vol1/chapter/4437/Variaus-Fossils

۵.۳۔ مَمالیوں کا کردار

محفوظ شدہ تاریخ کی یکسر تباہی سے یہ بات یقینی رہی ہے کہ اولین انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے دوسرے ممالیوں سے بالکل جدا ہیں۔ اپنے رہائشی علاقوں (جنگلات) کے لحاظ سے بندر، چھوٹے بندر (Lemurs) لنگور، اور چمپانزی وغیرہ بہت سادہ زندگی گذارنے اور جنگلوں تک محدود رہنے کے عادی رہے ہیں۔ ان حیوانات کی فطرت ہی درختوں پر رہنا، انہی پر سونا، اور انہی کے پھل کھانا وغیرہ ہیں۔ مستقبل کی کوئی فکر، کوئی منصوبہ بندی اور کوئی نقشہ کار ان کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ البتہ شکار کرنا ایسی فطرت ہے جو دونوں زندگیوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔ مگر اپنی نوعیت کے لحاظ سے دونوں میں اس کا فرق بہت ہے۔ یاد رہے کہ جنگل کے سب سے ماہر شکاری شیر کہلاتے ہیں جو اپنے شکار کے لیے کوئی ہتھیار استعمال نہیں کرتے۔ وہ اپنی قوت بازو سے شکار کرتے ہیں۔ لیکن جنگل کے بہترین شکاریوں میں بندروں کا کوئی مقام نہیں۔

اب ایک دوسرا پہلو باقی ہے۔ یہ ہجرت کا! رابرٹ کوہن (۱۰) نے اپنی کتاب Migration میں انسانی ممالیہ جانوروں کی ہجرت کا نسلِ انسانی کے آغاز سے جائزہ لیا ہے اور واضح کیا ہے کہ انسانی معاشرے، رہائشی علاقے اور ان کے رہائشی جانور، خصوصاً انسانی مماثل جانور، ہجرت کے لحاظ سے ہمیشہ مختلف، متنوع اور الگ رہے ہیں۔ اس سے حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ دوسرے جانوروں یا مماثل انسان خصوصاً سماجی اور ثقافتی لحاظ سے ضرور ڈاکِسن کی بس کو ان حقائق نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

۶۔۳۔ ابتدائی سحابیئے کی بطور خام مواد فراہمی

۷۔۳۔ بگ بینگ سے قبل

جب ہم اس معاملے پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو تخلیق کے اگلے مرحلے ''بگ بینگ'' کی جانب بلا تاخیر چل پڑتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیق کے بالکل ابتدائی مرحلے ہی سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جو دراصل کسی بڑے دھماکے کا پیش خیمہ اور اس کا خام مواد تھا اور یہی عظیم دھماکہ نظام شمسی اور کہکشاؤں کو جنم دینے کا سبب بنا تھا۔ تو پھر اس ابتدائی تخلیقی مرحلے کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے؟ کیسے ممکن ہوا کہ کوئی مادہ پھیلنا شروع ہو اور بڑھتے بڑھتے اتنا بڑا ہو جائے کہ ہر چیز ہی اس سے وجود میں آجائے؟ یہ مادہ جب پھیلنا شروع ہوا تھا تو کیا یہ وہاں آپ سے آپ موجود تھا؟ اگر ہاں، تو کیسے؟ خام مواد اچانک کہاں سے سامنے آ گیا؟ پیداواری عمل میں خام مواد کی ضرورت تو سب سے اولین ہوتی ہے۔ تو کیا کائنات، یا ہر قسم کی دیگر کائناتوں کو وجود میں لانے کے لیے اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس سوال کا واحد عقلی جواب یہی ہے کہ ابتدائی خام مواد کی فراہمی، خود اس کے خالق نے کی تھی۔ صنعت مالکان تو اس نکتے سے اتفاق کر لیں گے۔ اور اس مرحلے پر اگر آپ بھی مذکورہ حقیقت کو تسلیم کر لیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعد میں کیوں سے تسلیم نہیں کریں گے؟

۸۔۳۔ قدیم حیاتیات Paleontology میں ذاتی مقصد

اس ضمن میں ڈارونیئن عقیدۂ تخلیق کے موضوع پر اعلیٰ ترین سطح کے دو سائنسدانوں Fred Hoyle اور Chandra Wickramasingh کی پیش کردہ ایک فیصلہ کن وضاحت ذیل میں دی جاتی ہے۔

''ایسی تحریروں کی تلاش کوئی مشکل امر نہیں ہے جس میں یہ افسانہ پیش کیا گیا ہو کہ حیاتیات کے مختلف آثار و ڈھانچوں (کے ریکارڈ) کی بنیاد پر ڈارون کا نظریہ بالکل درست پایا گیا ہے، لیکن سنجیدہ حضرات محسوس کرتے ہیں کہ جتنی عمدہ تحریروں سے اسے مزین کیا گیا تھا، اتنے ہی اس کے دعوے کمزور ہیں۔ بہترین تحریروں کے پردوں میں بھی ڈھانچوں کے ریکارڈ میں غیر اکملیت نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر ارضیاتی تحریری مواد کا جائزہ لیا جائے تو بالآخر سچائی سامنے آنے لگتی ہے۔ ڈاروینی نقطہ نظر سے فوسل ریکارڈ بہت زیادہ نامکمل نظر آتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ماہرین حجریات Geologists کے بیانات میں کوئی جھول پایا جاتا ہے، بلکہ اس لیے کہ ارتقائی مراحل کی درمیانی کڑیاں موجود ہی نہیں ہیں۔ اگرچہ قدیم ماہرین حیاتیات نے اس حقیقت کو ایک صدی یا اس سے قبل ہی محسوس کر لیا تھا، لیکن میدان کے تسلیم شدہ ماہرین ہونے کے باوجود وہ اس بارے میں کوئی باہمی اتفاق رائے پیدا کرنے میں ناکام رہے تھے۔''(۱۱)

مذکورہ سائنس دانوں کا بیان ابھی جاری ہے۔

''وہ شرح جس سے حیاتیاتی کیمیا Polvpeptide مثلاً ہیموگلوبین کی خاطر ہونے والی تبدیلیاں لیبارٹریز میں جانچی گئیں تو وہ فی نسل ۱۰^۵ سے بھی زیادہ نہیں پائی گئی۔ یہ ایسی شرح ہے جو بالمقابل Polypeptide سلسلے کے انفرادی مقامات پر، مخصوص قسم کی محض ۱۰ ایمنوایسڈ کی ضرورت، برائے تبدیلی و مناسب کارکردگی درکار ہوتی ہے۔ تو مطلوبہ اہتمام، تبدیلی کے فی ۷ ۱۰^۸ سے بھی کم رہی۔ کسی Polypeptide سلسلے کی مخصوص قسم کی محض ۱۰ ایمنوایسڈ (مختلف ابتدائی اہتمام سے شروع کرتے ہوئے) تبدیلی (ہجرت) کے ذریعے نہیں معلوم کیا جاسکتا۔

ماسوائے اس کے کہ وہ غصے ور مچھلی Fluke کی مانند ہو۔ ڈارون کا ارتقا صرف ایک Polypeptide بھی حاصل کرنے میں ناکام رہے گا، بجائے اس کہ کہ ایک ہزار! جن پر زندہ خلیے اپنی زندگی کے لیے انحصار کرتے ہیں۔ ماہرین جینیات کو یہ حقیقت خوب معلوم ہے، لیکن اس نظریئے کے بارے میں ان میں سے فیصلہ کن سیٹی بجانے پر کوئی بھی تیار نہیں ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس کو سنجیدگی سے پڑھنے کے بعد آثار و ڈھانچوں کی مشکل با آسانی حل ہو جاتی ہے۔ ویسے تو یہ تفصیل تو ہم خود بھی دے سکتے تھے، لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ موضوع سے متعلق دو عظیم ماہرین کی آرا ہی سامنے رکھے جائیں تا کہ ہماری غیر جانبداری کا تاثر ابھر سکے۔ مذکورہ دونوں سائنسدانوں کا قول یہ ہے کہ ڈاروینی نظریئے کے ثبوت کے لیے کوئی ارضیاتی دلیل، مثلاً ڈھانچہ جاتی ریکارڈ، ہرگز بھی نہیں پیش کرنا چاہیے۔ دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ ڈاروینی ارتقا پر ڈھانچہ جاتی ریکارڈ اگر ہے بھی تو کس قدر کمزور ہے۔ کیوں کہ ڈارون اور پیروانِ ڈارون جو کچھ بھی اس سے ثابت کرنا چاہ رہے تھے، وہ مطلق ثابت نہیں ہو سکا۔ سوم یہ کہ Polypeptides کی پیدائش کے لیے حیاتیاتی معلومات، ہر ماہر جینیات اور طالب علم جینیات پر واضح ہے کہ سست ترین ارتقا، ڈارون کے پیش کردہ اصول کے مطابق ایک واحد جنین بھی پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ آخری حصے میں دونوں ماہرین نے اس امر پر بھی تعجب کا ظاہر کیا کہ سب کچھ جاننے کے باوجود جینیاتی ماہرین اس حقیقت پر لب کشائی کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتے؟ سو اس تمام بحث سے ہم با آسانی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ڈارون نے اپنے نظریئے کو سچا ثابت کرنے کے لیے بلاوجہ ہی فوسل ریکارڈ کا سہارا لیا تھا۔ چناں چہ سوال یہ ہے کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے؟ حقیقت کو مان لینا یا اسی طرح دھکے کھاتے رہنا؟

۹۔۳۔ ڈارون کا نظریہ ارتقا، غلطیوں سے مبرا ہے؟

سائنسی نقطہ نظر سے جب تک کسی نظریئے کو سائنسی لحاظ سے مکمل درست نہ ثابت کر دیا جائے، وہ محض نظریہ ہی رہتا ہے۔ علمی زبان میں، ناقابل تردید حقیقت ہی کو عالمی سچائی گردانا جاتا ہے۔ ڈارون کے نظریئے کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس زمرے میں رکھا جائے؟ نظریہ یا حقیقت؟ یا عالمی سچائی؟ صحیح جواب پر پہنچنے کے لیے ہمیں ان تینوں اصطلاحوں کی تعریف پر جانا پڑے گا۔ مثلاً یہ کہ حقیقت کیا ہوتی ہے؟ دیکھیں یہاں چاند بھی ہے، سورج بھی ہے اور آسمان بھی ہے۔ لہٰذا یہ ایک خلائی حقیقت ٹھہری! انسان کو لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دو ہاتھ اور دو پاؤں ہیں۔ سو یہ ایک تخلیقی حقیقت ٹھہری! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت جسے دنیا بھی تسلیم کرے، وہی آفاقی حقیقت ہے۔ جھوٹ بولنا ایک آفاقی سچائی ہے۔ انسان محبت اور ہمدردی کا طالب ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک آفاقی سچائی ہے۔ تو پھر یہ نظریہ کیا ہے؟ وکی پیڈیا کی مدد لیں تو وہ ہمیں سمجھاتی ہے کہ ''کوئی ایسا مواد جس پر بہت زیادہ عقلی غور کیا گیا ہو، یا کسی معاملے کے بارے میں ایک عمومی اور سب کو سمیٹتی ہوئی سوچ، یا ایسی سوچوں کے نتائج، عقلی اور غور و فکر کے مراحل کا مشاہداتی مطالعہ اور تحقیق و جستجو''۔ (۱۳)

اس لیے نظریئے کی تعریف کے لحاظ سے غور و فکر شدہ کوئی معاملہ جسے تحقیق اور مشاہدے تینوں، یا دو کی بھی قوت حاصل رہی ہو، مفروضے کے لحاظ سے ایک نظریہ ہی ہے۔ یہ ایک خالص تفکر ہے جو اس کی تکمیل سے پہلے یا اختتام پر، ٹھوس و حتمی اسباب شاید دے بھی سکیں یا شاید نہیں۔

اب اگر ذرا ان تینوں اصطلاحات کو ڈارون کے نظریئے پر منطبق کریں تو کیا وہ

نظریہ، حقیقت نظر آتا ہے؟ نہیں، کیوں کہ کوئی بھی سچائی شک و شبہے سے بالکل بالاتر ہونی چاہیے۔ جب کہ ارتقا میں ہر ہر مرحلے میں شکوک ہی پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ یہ آفاقی سچائی نہیں ہے۔ آفاقی سچائی ہر جگہ ہی اسی انداز سے تسلیم کی جاتی ہے، مگر نظریہ ارتقا کو تو خود بعض سائنس دان بھی تسلیم نہیں کرتے۔ تو کیا اسے ایک نظریہ ہونا چاہیے؟ جواب ایک بار پھر ''نہ'' میں ہے، کیوں کہ اپنی تعریف کے لحاظ سے نظریئے کو بھی کوئی عقلی تفکر درکار ہوتا ہے۔ مگر نظریہ ارتقا میں دانشمندانہ تفکر کا فقدان ہے۔ وہ صرف مفروضات ہی پر مبنی ہے اور مفروضے کو سائنسی لحاظ سے ہرگز بھی نظریہ نہیں مانا جاسکتا۔ خاص طور پر تب جب کہ اس میں:

(۱)...... ماحولیات سے متعلق مشاہدات بھی موجود نہ ہوں۔

(۲)...... مفروضے سے کوئی بامعنی تصویر بھی نہ ابھرتی ہو۔

(۳)...... موضوع میں مباحثہ جاتی تنازعات بھی پائے جاتے ہوں۔

(۴)...... ماہرین حیاتیات بھی اس کے بنیادی امور سے اتفاق نہ کرتے ہوں۔

تو پھر اسے کس لحاظ سے نظریہ تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیا چیز ہے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ ایک فطری مفروضہ! چناں چہ یہیں سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کیا ڈارون کا نظریہ غلطیوں سے مبرا ہے؟ جی بالکل نہیں! اور مفروضہ تو ہوتا ہی ہے غلطیوں پر مشتمل! اگر ہم مفروضات ہی کو یقینی سمجھ لیں تو پھر سائنس کیسے آگے بڑھے گی اور کیسے سائنس کا ارتقا ہو سکے گا؟

۱۰.۳۔ نظریہ ڈاروینیئت میں غلطیاں

اس سوال پر غور کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقا اور اصل

حیاتیاتی ارتقا میں فرق سمجھ لیا جائے۔ حیاتیاتی ارتقا کا مطلب ہے زندہ مخلوقات کا حالات و ماحولیات کے مطابق خود کو ڈھالنا اور تبدیل کرنا، (Mutation) جو ایک قدرتی عمل ہے۔ جیسے کہ سنہری چھوٹی چڑیائیں (Finches) جنہوں نے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اپنی چونچیں لمبی کرلیں، جیسا کہ ڈارون بھی قرار دیتا ہے۔ دوسری جانب ڈاروینی ارتقا کا مطلب ہے زندہ مخلوقات کا خود اپنی ہیئت کو مکمل طور پر کسی اور ہیئت میں تبدیل کرنا، جیسے ڈائنوسار نے پرندوں کی شکل، آبی ممالیوں نے وہیل مچھلیوں کی شکل اور بن مانسوں نے انسان کی شکل اختیار کی۔ چناں چہ اس لحاظ سے یہ ارتقا بالکل الگ چیز ہے اور اسی وجہ سے ارتقا کہنے کے بجائے اسے ڈاروینیئت کہنا چاہیے (جیسا کہ اسے ڈارون کے نام سے جانا جاتا ہے) لہٰذا اعتراض ارتقا کے عمل پر نہیں ہے بلکہ ڈارینیئت پر ہے جو کچھ ڈاروینیئت نے پیش کیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۱.۳۔ تاریخی سائنس اور تاریخی عنصر کو نظر انداز نہ کرنا

یہ بڑی ناانصافی ہوگی، اگر نسل انسانی کی دستاویز (تاریخ) اور عقائد کی تاریخ کو نظر انداز کردیا جائے۔ تاریخ سے ہٹ کر اگر آثار و ڈھانچے کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے تو پھر مہذب تاریخ کو بنیاد کیوں نہیں بنایا جاسکتا؟ مہذب تاریخ انسانی نے اپنی تخلیق پر انسانی عقائد کی بہت وضاحت کی ہے اور بشمول دیگر انسانوں کے، اس نے ان تمام باتوں کو محفوظ بھی رکھا ہے جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انہوں نے زبانوں کے معاملے میں تصویروں اور ٹیکنیکس کو بھی استعمال کیا ہے۔ مزید، متروک زبانوں کے ساتھ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کی حفاظت کے لیے متحرک

تصویروں کو بھی کام میں لایا ہے۔ ان متروکہ زبانوں اور خاکوں نے اُس دور کے تمام تمدنوں اور تہذیبوں کی وضاحت عمدہ ترین انداز میں کی ہے، لیکن نہ ہی متروک زبانوں اور نہ ہی تحریری تاریخوں نے جسمانی تبدیلیوں کے کسی ایک بھی واقعے کی نشاندہی کی ہے کہ وہ بدل کر کچھ سے کچھ اور ہو گئے تھے۔ اس دور کے لوگوں نے جو بذاتِ خود جانوروں کو چلاتے تھے اور جانوروں ہی کی کھالوں کی پوشاک پہنتے تھے، اگلے درجوں میں ان کی ترقی کے بارے میں کوئی ایک بھی غیر معمولی صورت حال بیان نہیں کی ہے۔ تو پھر تاریخ سے کیا سبق اخذ کیا گیا؟ ڈاروینی متبّعین نے یقیناً تاریخ کی نفی کی ہے اور افسوس کہ اسے تسلیم کرنے کو بھی وہ تیار نہیں! قانون سے ناواقفیت، کوئی بہانہ تو نہیں ہوا کرتی! ناواقفیت کے باوجود اگر خلاف ورزی کرنے والے کو سزا مل کر رہتی ہے تو خدا کو نہ ماننے والے کسی شخص کو بھی اس کا عذر کسی کام نہیں آ سکے گا۔

۱۲ . ۳۔ تاریخ ہمیں اب اس حصے کی طرف لے جاتی ہے جب تبدیلی کا دورانیہ ہر مرحلے پر آتا ہے۔ اس معاملے میں دہریوں یا روحانی سائنسدانوں کے درمیان جنگ برپا نہیں ہونی چاہیے، بلکہ سائنس کا کام ہی یہ ہے کہ دونوں میں یکسانیت پیدا کرے۔ اور اگر دونوں میں مطابقت نہ نظر آتی ہو، تب بھی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ عملی سائنس وہی ہوتی ہے جو مسائل کو زیادہ واضح کر کے بتائے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں نے جب بھی ذرا مختلف حالات کا سامنا کیا، تو ان کے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی تبدیلی، منتقلی اور نئے حالات میں ڈھل جانے کا عمل کیسے رونما ہوا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ تاریخ کے کسی بھی مرحلے پر یہ تمام افعال کبھی رکے نہیں۔ اس لیے آپ کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کے بالکل آغاز ہی

سے تبدیلی و منتقلی کے یہ افعال جاری رہے ہیں۔ تو پھر دہریت درمیان میں کہاں سے آ گئی؟ انسانی جنین جس طرح کی خصوصیات رکھتی ہیں، انہیں وہ اپنے ساتھ روزِ اول ہی سے لے کر چلتی رہی ہیں۔ تو مذہب کی مانند دہریت میں بھی یہ افعال کیوں جاری نہ رہے؟ انسان میں چوں کہ بالکل آغاز ہی سے مذہبیات کے جینیز موجود رہے ہیں تو یہ ہمیشہ ہی سے متحرک رہے، جن سے ایک مہذب معاشرہ وجود میں آتا رہا ہے۔ مذہب نے ہر جاندار معاشرے میں اپنا مناسب کردار ضرور ادا کیا ہے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف حیاتیاتی ارتقا کی دریافت کے بعد ہی مذہب کو اس میں داخل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟ ڈارون نے جو کچھ پیش کیا تھا، وہ صرف ایک حیاتیاتی واقعہ تھا، نہ کہ مذہبی واقعہ! ڈارون نے اسے مذہبی معاملہ نہیں بتایا تھا اور نہ کسی اور نے بتایا تھا۔ اس لیے سائنسدانوں نے پھر اس حیاتیاتی واقعے کو مذہبی رنگ کیوں دے دیا؟ کیا انہیں بس اپنی حدود میں نہیں رہنا چاہیے تھا؟ کیا سائنسدان نہیں کہہ سکتے تھے کہ ارتقا کے عمل کو خدا نے جاری کیا تھا؟ مذہب سے سے اتنی نفرت؟

۱۲ . ۳۔ سائنس صرف امکانات سے متعلق ہے

جب ہم سائنس کی بات کرتے ہیں تو پہلا لفظ جو ہمارے ذہنوں میں آتا ہے وہ ''امکان'' ہے۔ مطلب یہ کہ کسی سائنسی نظریئے میں آپ کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ صرف ایک ''امکان'' ہی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن حیران کن طور پر بے خدا ذہن خاص اس ارتقائی معاملے میں بالکل حتمی فیصلہ کرنے والا ہی بن گیا۔ پھر کیا ہوا ہے کہ سائنس اپنی بنیاد سے ہٹ کر ذہن میں نہ صرف پہلے سے بیٹھے ہوئے ایک تصوراتی وحتمی

معاملے پر قائم ہوگئی بلکہ لاتعداد اعداد و شمار اور حقائق سے بھی صرف نظر کرتی چلی گئی۔
مثال کے طور پر معروف دانشور نوم چومسکی اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''محض چند سال پہلے ہی ایک تحقیق اس بات پر ہورہی تھی کہ مسئلہ ارتقا پر انسان کیا سوچتے ہیں؟ جو لوگ ڈارون کے نظریئے پر یقین رکھتے تھے، وہ صرف ۹ فیصد تھے، جبکہ دنیا کی آدھی آبادی کا اعتماد خدائی ارتقا پر تھا۔'' (۱۴)

مطلب یہ ہے کہ سائنس دان اور دہریئے لوگ نظریہ اور تصور ارتقا پر دنیا کی بڑی آبادی کو اپنے موقف پر قائل نہیں کر سکے۔ وجہ ظاہر ہے۔ ان کے پاس کوئی ٹھوس دلائل نہیں تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکنس اور دوسرے لاخدا لوگ اس انداز کا بیانیہ کیوں پیش کرتے ہیں اور اس حقیقت پر توجہ کیوں نہیں دیتے؟ کیوں اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر کمزور میدان میں کھڑے ہیں؟ اور اس کے باوجود اتنے اہم معاملے پر بڑے بڑے دعوے کرتے چلے جارہے ہیں۔ حقیقت کا ادراک انہیں اب تو کم از کم ہو ہی جانا چاہیے تھا۔ معاملہ صرف احساس کرنے کا ہے جس کے بعد نقطہ نظر میں تبدیلی از خود پیدا ہونے لگتی ہے۔

۱۴.۳۔ سائنسی طریقہ کار

سائنسی طریقہ کار کی بنیاد مشاہدات اور تجربات سے معلومات اکٹھا کرنا ہے۔ (سائنس ڈیلی) اس لیے پہلا نکتہ ہی یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ ڈارونی نظریہ ارتقا نے سائنسی طریقہ کار کی پیروی کی ہے یا نہیں؟ (۱۵) جیسا کہ سائنسی طریقہ کار کی تعریف کی ہے، اس میں دو چیزیں لازمی موجود ہونی چاہئیں۔ اول مشاہدہ اور دوم تجربہ۔ اس لیے آیئے ڈارونی ارتقا کو ہم دونوں پہلوؤں سے جانچنے کی کوشش کریں۔

۱۵.۳۔ مشاہداتی گواہی

اس نظریئے میں مشاہداتی گواہی بالکل مفقود ہے۔ اُس کے مطابق ارتقا کا عمل کم از کم چھ سے ساڑھے چھ کروڑ سال پہلے ہونا شروع ہوا تھا۔ چناں چہ قدرتی بات ہے کہ اس دعوے کا مشاہدہ بالکل بھی نہیں کیا جاسکتا۔ واحد شہادت، ڈھانچہ جاتی ریکارڈ کی ہے۔ مثلاً چھوٹی چڑیاؤں (Finches) کے ساخت و آثار! لیکن یہ بھی حیاتیاتی ارتقا ہے نہ کہ ڈارونی ارتقا۔ (تفصیل آگے پیش کی جائے گی) چناں چہ جب واقعاتی شہادت ہی موجود نہیں ہے تو پھر سائنسی طریقہ کار بھی پورا نہیں ہوسکتا اور سائنسی نظریہ بھی نہیں بن سکتا۔

۱۶.۳۔ ڈارونی ارتقا، مشاہدے کے قابل ہے ہی نہیں!

اس ارتقا کی یہ کمزوری سائنسی ہے۔ فنچز کے آثار و باقیات کی مثال سے بھی یہ محض ایک حیاتیاتی ارتقا بن کر سامنے آتا ہے نہ کہ ڈارونی ارتقا۔ نہیں بھولیے کہ ڈارونی ارتقا کا مطلب حیات کی اصل جنس میں تبدیلی ہے نہ کہ خصوصیت اعضا میں تبدیلی۔ اس لیے ڈارونی ارتقا ناقابل مشاہدہ ہے۔

۱۷.۳۔ جنس میں تبدیلی

سب سے بڑا سوال اس بارے میں یہ ہے کہ پوری تاریخ میں، ڈھانچہ جاتی یا قدیم حیاتیاتی، کسی عضو میں بھی کوئی تبدیلیٔ جنس ہوئی ہے یا نہیں؟ جواب ہے کہ بالکل نہیں۔ بیکٹیریا آج بھی بیکٹیریا ہی ہے۔ چھوٹی چڑیائیں (Finches) آج بھی چڑیائیں ہی ہیں۔ مچھلی آج بھی مچھلی ہی ہے اور لنگور آج بھی لنگور ہی ہیں۔ تو پھر ڈارونیت کا بنیادی نکتہ ''جنس میں تبدیلی'' کب اور کہاں ہوئی تھی؟ اس میں جب

خار پشت مچھلیوں جیسی مثالیں دی جاتی ہیں تو ڈارونی حضرات خود مانتے ہیں کہ تا حال بھی وہ مچھلی ہی ہے اور صدیوں سے اس کی نوعیت و جنس میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوسکی ہے۔ کسی خاص عضو میں تبدیلی، ڈارونی نظریۂ تبدیلی سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ آیئے ذیل میں اس کا بھی جائزہ لیں۔

۱۸.۳۔ ماحول کے مطابق ڈھلنا

غلطی سے اکثر و بیشتر بلکہ ہمہ وقت، ماحول کے مطابق ڈارونی لحاظ سے ڈھل جانے کو ارتقا کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ سماجی علوم کی زبان میں وہی شخص جو کبھی امیر کبیر تھا اور عیش بھری زندگی گذارنے کا عادی تھا، گردش حالات کی بنا پر یکدم مالی تنگی کا شکار ہوجاتا ہے اور اپنی تمام پُرتعیش زندگی بھول کر محض عام سی زندگی گذارنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ تو اس کے اس عمل کو، اردگرد کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے ہی کا نام دیا جائے گا، نہ یہ کہ اس نے کوئی ارتقائی عمل انجام دیا ہے۔ اسی کے ساتھ حیاتیاتی ارتقا میں عقل کا استعمال بھی لازمی ہے، لہٰذا اگر کسی پرندے نے اپنی چونچ ماحول کے لحاظ سے نسبتاً مختلف کرلی ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے ارتقا کرلیا ہے۔ یا یہ کہ اس نے خود کو ماحول کے مطابق ''ڈھال'' لیا ہے، کیوں کہ پرندہ تو اپنی جنس میں آج بھی پرندہ ہی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس نے اپنے اندر کوئی مخصوص تبدیلی کرلی ہو۔ (اپنی جنس یا نسل کے لحاظ سے اس میں کوئی ارتقائی یا عملی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ مترجم) چناں چہ یہ جو باریک سا فرق ہے، ڈارون کے حامی اسے یا تو جان بوجھ کر، یا غیر شعوری طور پر غلط تعبیر دے رہے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جو میں دیر سے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ''حیاتیاتی ارتقا کچھ اور عمل ہے اور ڈارونی ارتقا کچھ اور۔''

۱۹.۳۔ باقیاتی (آثاری) عضو کا جھوٹ

چارلس ڈارون نے دعویٰ کیا تھا کہ انسانی جسم میں بعض آثاری اعضاء ایسے پائے جاتے ہیں جو قدیم آباء واجداد کی نشانیاں کہلاتی ہیں۔ اپنی کتاب The Descent Man، ۱۸۹۰ء میں اس نے ان اعضاء کی ایک فہرست بھی شامل کی ہے۔ مگر حیران کن طور پر جن اعضاء کو اس نے ''بیکار'' قرار دیا تھا، پورے جسم میں ان کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے Coccyx کو (حالاں کہ یہ نام بھی درست نہیں ہے) لنگور کی دم کی باقیات کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانوں کے آباؤ اجداد کی باقیات! اسی لیے اسے دُم کی ہڈی یا Coccyx کا نام دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ انسانی جسم میں یہ ایک ''عضو بے حیثیت یا باقیاتی عضو'' ہے۔ مگر دوسری جانب تازہ ترین تحقیقات کے مطابق ''یہ Coccyx دراصل نسوں کے ٹھوس گچھوؤں، نسوں کی مضبوط پٹی اور عضلاتی پٹھوں کا منسلکہ حصہ ہے، بلکہ پیڑو کے بعض حصوں کے پٹھوں میں نفوذ کا کام بھی کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی کا یہ حصہ مرد و زن کے بیٹھنے کے دوران انہیں مضبوطی بھی فراہم کرتا ہے۔'' (۱۶)

پس ثابت ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا یہ آخری سرا اپنا کوئی خاص فریضہ ضرور رکھتا ہے اور بالکل آخری حصے میں حرام مغز کے معاون کے طور پر اہم کام انجام دیتا ہے۔

Coccyx کی مانند انسانی جسم کے اپینڈکس کو بھی بن مانسوں کی باقیات بتایا جاتا ہے۔ جب کہ سائنسدانوں کا قول ہے کہ ''اپینڈکس کے اندر نظامِ مدافعت کے جو خلیے پائے جاتے ہیں، وہ دراصل مفید بیکٹیریا کے تحفظ کی خدمات ہی انجام دے رہے ہیں۔ ایک حیاتیاتی فلم میں انہوں نے انتڑیوں میں اس کی موجودگی ثابت کی ہے۔ خورد بینی جرثوموں، گندے مواد، اور مدافعتی نظام کے شکلوں میں یہ ایک باریک پیچیدہ

دوسرا پروف

تہہ ہوتی ہے جو معدے سے آنت تک کی نالی میں ایک ساتھ مقیم ہوتی ہے۔" (۱۷)

لہٰذا جدید سائنسی تحقیقات نے ثابت کیا کہ انسانی جسم میں اپینڈکس کا بھی ایک ناگزیر کام ہے۔ اس لیے ان مذکورہ اعضاء پر "عضوِ مہمل" کا ایبل کیسے چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ محض آپ کے تصور مخصوص کو تقویت دینے کی خاطر ہی؟ ایسے ہی حقائق، دیگر آثاریاتی اعضاء کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ جیسے کان کے عضلات جو سماعت اور عقل کی داڑھ (چبانے کا کام انجام دینے والے) میں مدد دیتے ہیں۔ لہٰذا ان اہم اور فرائض پہ ہمہ وقت متعین اعضاء کو کیسے کوئی "بے مقصد" قرار دے سکتا ہے؟ ڈارونی لوگ انہی باقیاتی و آثاری اعضاء کو پکڑ کر اپنی نظریئے کو ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں!

۳.۲۰۔ خلاصے کے طور پر ڈارونی تصورِ ارتقاء محض غیر سائنسی ہے

مندرجہ بالا تمام مباحث وثوق سے بتاتے ہیں کہ اس قسم کا تصور ہرگز بھی سائنسی حقیقت نہیں ہے، لیکن ڈارون کے اتباع میں تمام ڈارونیوں نے بھی اسے ایک لازمی عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ ڈارون کا مسئلہ یہی ہے کہ نہ صرف اس نے سائنسی تحقیقی طریقہ کار اختیار نہیں کیا بلکہ اس کے بنیادی اصولوں کو بھی روند کر رکھ دیا۔ ماحولیاتی لحاظ سے تبدیلی ایک حیاتیاتی حقیقت ہے جو سائنسی بھی ہے اور مشاہدے میں بھی آتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ڈارونی نظریہ ارتقاء محض مفروضات پر مبنی ہے۔ یہی نظریہ ہے جس کی بنیاد پر دہریت قائم ہے۔ ورنہ پوری کی پوری عمارت دھڑام سے گر جائے۔ ان کے مطابق انسانوں کا وجود مچھلیوں اور لنگوروں کا مرہونِ منت ہے، یعنی وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں! چناں چہ یہیں سے ہمارے ذہنوں میں تخلیق اور احسن الخالقین کا عقیدہ ابھرتا ہے۔

5, www.halthline.com>human-body-maps>coccye

6. www.nadicalnewstoday.com>articles

۳.۳۱۔ نتیجہ

مندرجہ بالا باب سے "واہمۂ خدا" "The God Delusion" مصنف چارلس رچرڈ ڈاکنس کی بنیاد کا پتہ لگتا ہے۔ اس کا عقیدہ حقائق سے کوسوں دور ہے اور بس خلا میں معلق ہے۔ مزید مطالعے نے ظاہر کیا ہے کہ نام نہاد باقیاتی رڈھانچہ جاتی آثار بھی ڈارون کے نظریئے کی مدد نہیں کر سکے ہیں۔ اگلے صفحہ پر پیش کردہ Fossil Record چونکا دینے والا انکشاف کرتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں ایک سو اسّی لاکھ سال پہلے سے بھی کسی ایک عضو میں بھی اور کسی ایک لحاظ سے بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ بعض حیاتیات کی محض بعض خصوصیات میں نوٹ کی گئی تبدیلی کو "مطابقت پذیری" کہا جاتا ہے جو بذاتِ خود حیاتیاتی پیش قدمی ہے نہ کہ ڈارونی ارتقاء! خلاصے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موزوں، درست اور سائنسی ارتقاء ہی اصل میں حیاتیاتی ارتقاء ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندہ اجسام کی ذاتی نوعیت میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ کہ ان کے اپنے ماحول کے لحاظ سے ان کے اپنے اندر محض چند چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہی واقع ہوئی ہیں۔ ڈارونیئیت نے چوں کہ سائنسی لحاظ سے کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیے ہیں، اس لیے باوجود اس عقیدہ کے بار بار دہرائے جانے کے، اسے عقیدہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

حوالہ جات

1. Pbs.org>Wbgh>Evolution>Library

2 .Blbe.co.uk>Bitesize>Guides>Zwvpsg8>Revision

3. "Creation, Evolution, and Intellegent Design." Rabbanical Council of America, 2005

4. Evolution and Christian Faith: Reflecting of Evolutionary Biologist, avolution and christian faith.org

5. https://www.bettinking.org/does-evolution-disprove-creation/is-it.-possible-to-be-a-christian-and-believe-in-evolution

6. Sahih Al-Bukhari, Hadith No.246(2020)

7. harward.academia.edu>DanialHaqiqatjou.

8.https://yaqeeninstitute-org/wp-content/uploads/2016/11/Can-Islam-Object-to-Evolution.pdf

9. Sahih Bukhari, Vol 9, Book 93, Hadith 489

10. Cohen, R (2021) Migration 'The Movement of mankind from Prehistory to Present'

11. Holye, F-Wickramasighe, C(1981), Page 163, Evolution from Space, Great Britain: Granada Publishing.

12. Holye, F-Wickramsinghe, C (1981), Page 164, Evolution form Space,Great Britain: Granada Publishing.

13. Vocabulary.com>Dictionary>Theory

14. Chomsky,N.(2011), page 128, How the World Wokes, USA:Soft Skull Press.

15. Sciencedaily.com

16. Healthline.com>Human-body-maps>coccyx

17. Medicalnewstoday.com>Articles

باب چہارم

وجود خدا پر فلسفیانہ اور سائنسی و عقلی دلائل

تعارف

خدا، ماورائے فکر ہستی، علام الغیوب، ہر جگہ حاضر، خالق، پالنے والا، برباد کرنے والا، ذہن ترین اور عظیم ترین ڈیزائنر جیسی بے شمار خصوصیات اس کے نام کے ساتھ منسلک ہیں، اس کے نام کا لازمہ ہیں اور اس کا لقب ہیں۔ خدا ایک غیر مرئی وجود ہے اور سائنسی و فلسفیانہ لحاظ سے نسل انسانی کے آغاز ہی سے تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم اپنی ان خصوصیات کی بناء پر دنیا کے مختلف حصوں میں اسے مختلف ناموں سے جانا جاتا اور مختلف مذاہب میں مختلف طریقوں سے شناخت کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں متفرق نظریات ہیں اور اس کی عبادت و پوجا بھی متفرق انداز سے کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایک غیر مرئی طاقتور ہستی کے طور پر اسے ہر جگہ ہی تسلیم کیا جاتا ہے، البتہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ!

قدیم ادوار میں جب سائنس نے ترقی نہیں کی تھی، فلسفیوں کو بھی وہی اہمیت اور درجہ حاصل تھا جیسے آج کے دور میں سائنس دانوں کو حاصل ہے۔ حتیٰ کہ تب بعض معاشروں میں شعرا کی پوجا کی جاتی تھی اور بعض میں انہیں بہت اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس دور تک خدا کے بارے میں ایک جانب سے واقفیت بہت محدود تھی، یعنی ذہن کی جانب سے! دانشوروں کے دماغ نے تب اس بارے میں جو کچھ بھی سب کے سامنے پیش کیا، عوام نے اسے خوشی سے قبول کرلیا۔ لوگوں کو خدا کے بارے میں درست تعلیمات دینے کی خاطر زندگی کے ہر دور میں اگرچہ رسول بھی آتے رہے ہیں، لیکن

جیسے ہی وہ دنیا سے رخصت ہوئے، پیغمبروں کی تعلیمات کی جگہ تو ملاوٹ شدہ عبادات اور رسومات کی جگہ لینے لگیں۔ اس دور میں معاشرے کی رہنمائی کی خاطر سماجی نظریات کی خاطر، خصوصاً خدا کے بارے میں پیروی کے لیے، فلسفیوں کا کردار بھی اہمیت اختیار کرنے لگا تھا، وقت گذرنے اور نئی نسل کے غلبہ حاصل کر لینے کے بعد خدا کے بارے میں درست تصورات بہت ماند پڑنے لگے تھے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے فلسفیوں نے اپنے خیالات پیش کرنے شروع کیے۔ بعض نے خدا کے وجود ہی سے انکار کیا اور بعض نے اُسے اپنے اعتقاد کا لازمی حصہ بنایا۔ یہ متضاد نظریات ہندو فلسفے، عرب فلسفے اور یونانی فلسفے، سب میں یکساں پائے جاتے تھے۔ (اصل بات یہ ہے کہ انسان ہر دور میں خدا اور مذہب سے جان چھڑانے والا بنا رہا ہے۔ کیوں کہ اس کی پابندیاں اسے بہت کھلتی تھیں اور وہ خود کو اندر سے بندھا بندھا ہوا محسوس کرتا تھا۔ البتہ وہ جھاڑ پھونک اور دوا دارو کے طور پر بعض مذہبی رسومات کا ضرور قائل رہا۔ انسانی زندگی میں مذہب کے بارے میں مختلف نظریات کی کارفرمائی کی اصل وجہ یہی رہی ہے۔ پیغمبرانِ خدا کے قتل بھی، انسانوں کے اسی مکمل آزاد رہنے کی جیتی جاگتی تمنا کا نتیجہ تھے۔ (مترجم)

اس موقعہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلسفے کی اہمیت اب ختم ہوگئی ہے؟ کیا اس کی اتباع، بے حیثیت ہوگئی ہے؟ اس کا لازمی جواب ہے ''نہیں''۔ فلسفہ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے اور جب تک انسانی عقل زندہ ہے، علم کی حیثیت سے فلسفے کی پیروی ضروری رہے گی، بلکہ فلسفہ تو خود مذہب کا بھی لازمی حصہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مذاہب بدھ مت اور جینین مت، تو اپنی فلسفیانہ سوچ و بچار کے نتیجے میں ہی ابھرے تھے۔ جب کہ زندگی کے کئی اہم پہلوؤں کی تشریح کے لیے سامی مذاہب

نے بھی فلسفے کا خوب استعمال کیا تھا۔

سائنسی عرج کے بعد معاشرے میں سائنس نے بھی اپنی اہمیت خوب منوائی۔ لوگوں کے عقائد کا مرکز اب فلسفے سے ہٹ کر سائنس بن گیا۔ تاہم فلسفے نے اس موقعہ پر بھی اپنی اہمیت کم نہیں ہونے دی۔ سائنس نے یہ غلبہ اس وجہ سے پایا تھا کہ اس کے پاس ثابت کرنے کے لیے حیران کن دلائل تھے جب کہ فلسفے میں محض غور و فکر اور تصورات ہی تھے۔ تاہم انسانی مزاج میں بہرحال دونوں کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفہ انسان کے عقلی و ذہنی تقاضے پورا کرتا ہے جب کہ سائنس اس کے ثبوت کے فطری سوالات کا تشفی بخش جواب دیتی ہے۔ لہٰذا اس نقطہ نظر سے انسانی زندگی کے اہم پہلو، خدا کو بھی بطور خاص سامنے آنا چاہیے، تا کہ انسانی دماغ اور متفرق معاشروں میں اسے اس کا جائز مقام حاصل ہو سکے! اس مقصد کے لیے خدا کے سائنسی اور فلسفیانہ نکتہ نظر پر آگے ایک تفصیلی تبصرہ اور مذکورہ موضوع کو زیر بحث لانے کی خاطر عقلی دلائل کے ساتھ بعض معروف سائنسدانوں اور فلاسفروں کے موقف کو بھی پیش کیا جائے گا۔ نیز ہر سامی مذہب کے چند مفکرین/مذہبی علماء کے حوالے بھی رکھے جائیں گے۔

۲.۴۔ وجود خدا۔ فلسفیانہ دلائل

''خدا کا دھوکہ'' نامی اس کتاب میں ڈاکنس نے بڑی حد تک فلسفیانہ سوچ اختیار کی ہے۔ لیکن یہاں ہم اس کے اپنے فلسفیانہ خیالات سے ہٹ کر کچھ اور ہی فلسفیانہ تجزیہ پیش کریں گے۔ اپنے خیالات ہم دونوں نقطہ ہائے نظر میں توازن رکھنے اور تصویر کا دوسرا رخ سامنے لانے کی خاطر ہی آپ کے سامنے رکھیں گے۔

''خدا کا دھوکہ'' کے مطالعے کے بعد ذہن میں یہ بیٹھ جاتی ہے کہ خدا پر اندھا

اعتماد ازل ہی سے بیٹھ گیا تھا، حالاں کہ اس کی کوئی جڑ بنیاد نہیں تھی۔ لیکن فلسفیانہ لحاظ سے جب ہم اس کا مطالعہ غیر جانبدارانہ طور پر کرتے ہیں تو صورت حال مختلف نظر آتی ہے۔ چناں چہ اس بارے میں مجموعی پس منظر کو واضح کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ طے شدہ پیشگی نظریے کے خلاف بھی مساوی دلائل سامنے لائے جائیں جس کے بعد یا تو یہ نظریہ اپنی حیثیت کم کر دے گا یا پھر مزید ایک طاقت اسے حاصل ہو جائے گی۔ چناں چہ پیش کردہ نقطہ نظر کی درستگی کی خاطر لازم ہے کہ اس کے مخالف دلائل کو بھی ضرور سامنے لایا جائے۔ ماضی کے دور ہی سے کئی فلسفے ایسے رہے ہیں جنہوں نے اپنے ہی فلسفی ساتھیوں کے پیش کردہ تصورات کو رد کیا ہے۔ یوں کسی مخصوص موضوع کے صحت مند ماحول کی خاطر اس طریقہ کار کو اپنانا آج بھی ضروری ہے۔ لہٰذا خدا کے نظریے کو خدا کی خاطر ہی رچرڈ ڈاکسن اور ''واہمہ خدا'' کے دلائل کی پرکھ کے لیے، یہاں اسی طرح کے مقابل فلسفیانہ دلائل پیش کیے جائیں گے کہ آیا اس کی بنیاد ٹھوس ہے یا وہ محض تاش کے پتے ہیں؟

۳.۴۔ تخلیق

خدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سب سے اولین اور بنیادی دلیل ''تخلیق'' ہے۔ کسی عمارت پر نظر ڈالتے ہی ذہن میں آنے والا سب سے پہلا نکتہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا معمار کون ہے اور اس کی صلاحیت کس قدر ہے؟ ہم کمپیوٹر دیکھتے ہیں تو کسی تخلیق کار کمپنی کا تصور ذہن میں آتا ہے اور موبائل فون دیکھتے ہیں تو ہم پر اس کے متحرک نظام اور دیگر خصوصیات کی تحریک ہوتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو آج کی ''ہائی ٹیک'' جدید سائنس کا نتیجہ ہیں۔ مگر ان کے بارے میں بھی ایک تخلیق کار کا تصور پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تو یہ

کیسے ممکن ہے کہ ذہین ترین زندگی ''انسان'' کا تخلیق کنندہ کوئی بھی نہ ہو؟ بلکہ آسمانی کہکشائیں اور آسمان بھی ایک عظیم تخلیق کار کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ ہر آسمانی چیز، اجرام فلکی، چاند، سورج، تارے، اور کُرّے بالکل درست اور مقررہ طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور دل گواہی دینے لگتا ہے کہ انہیں بالکل ٹھیک ٹھاک طور پر ہی بنایا گیا ہے۔ شعور از خود شاہد ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو از خود وجود میں آ گئی ہو۔ نہ ہی ہم نے اپنے آپ کو، نہ ہی اجرام فلکی نے خود کو، حتیٰ کہ نہ ہی قدرت (فطرت) نے بھی خود کو اپنے آپ ہی بنایا ہے۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کرے گا تو ایک بالکل غیر سائنسی و غیر منطقی دعویٰ کرے گا۔ تو بس لیجیے، یہیں سے آپ کو دلائل کا سرا ہاتھ آ گیا۔

جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ساری کائنات ازل میں ایک بڑا مادہ تھی جو بعد ازاں گرد و غبار کا ایک ابتدائی سحابیہ (Nebula) بنی جس کے بعد عظیم دھماکہ ہوا اور جاندار کُرّے تشکیل پانے لگے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو وہ عظیم مادہ کہاں سے آیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے اندر سے یہ کہکشائیں اور سیارے وجود میں آئے؟ اگر اس بات پر اتفاق کر بھی لیا جائے تو یہ سحابیہ پہلے چھوٹا تھا، پھر اس پر مزید مواد جمع ہوتا چلا گیا، اور پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ پھیل گیا، تب بھی اس سوال سے تو ہم پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ چھوٹے سحابیے کہاں سے آئے تھے؟ وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی جو بعد میں مل کر ایک بڑا مادہ بنا، وہ کیسے سامنے آیا تھا؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ یہ دعویٰ کرنا کہ کسی چیز نے اپنے آپ کو از خود ہی جنم دے دیا ہے، یا ''لاشے'' سے ''شے'' وجود میں آ گئی ہے۔ ایک بالکل غیر سائنسی دعویٰ ہے۔ ''لاشے'' ہرگز بھی ''شے'' کو وجود میں نہیں لا سکتی۔ اگر کوئی عمارت، کوئی کمپیوٹر اور کوئی موبائل فون خود سے جنم نہیں لے سکتے تو انہی کی مانند جامد اور غیر متحرک اشیاء کس طرح خود کو جنم دے سکتی

ہیں؟ اسی سے اس پوشیدہ حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ بالکل ازل میں کوئی نہ کوئی تو ضرور تھا جس نے ہر چیز کو وجود بخشا۔ کائنات کا ایک معمولی سا ذرہ (پارٹیکل) بھی اپنا ایک خالق رکھتا تھا جو بعد میں آہستہ آہستہ اپنے اپنے صحیح مقام پر جمع ہوتا چلا گیا۔ چناں چہ آج کی یہ کائنات بھی اسی حسن ترتیب ایک اعلیٰ ترین زندہ تخلیق ہے۔ کوئی تخلیق کار تھا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اپنی حالت میں اکمل ترین بنایا۔ تو بس ''وہی خدا ہے، وہی خدا ہے۔'' مقتدر، اعلیٰ ترین، ہمہ با اختیار، ہر کام کا کرنے والا، اور نقص سے قطعی پاک! اگر وہ خود ایسا ہے تو یقیناً اس کی تخلیقات بھی ایسی ہی ہوں گی۔

۴.۴۔ وجودِ خدا۔ سائنسی دلائل

اپنے دلائل میں وزن کی خاطر جیسے یہ ضروری ہے کہ علمی لحاظ سے گفتگو کی جائے، اسی طرح اس سے بھی ضروری یہ ہے کہ حقائق کے لحاظ سے بھی اسے مستند ہونا چاہیے۔ جن حقائق کو آج دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے، وہ محض سائنسی ہیں۔ اس لیے دنیا سے منوانے کے لیے اپنے مضمون کو صرف سائنسی حقائق کے ساتھ ہی سامنے لانا چاہیے۔ ڈاکِسن نے بھی کتاب God Delusion میں اپنے تصورات کو مضبوط تر کرنے کی خاطر یہی طریقہ استعمال کیا ہے۔ چناں چہ اس معاملے میں تو ہم سب کا اتفاق ہی ہے۔ اب ضروری ہے کہ اپنی بات منوانے کے لیے خدا خود سائنسی حقائق سامنے لائے۔ کیوں کہ آج کے دور میں اس کے بندے یہی تقاضا کرتے ہیں۔ بلکہ کتاب ''واہمہ خدا'' کی تردید کے لیے بھی یہی اندازِ فکر ناگزیر ہے۔ ڈاکِسن نے گویا یہ ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ خدا پر یقین نہیں رکھتا ہے تو اس کی بنیاد بھی ''سائنسی'' ہی ہے۔ اس لیے آیئے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں خود سائنس کیا نظریہ پیش کرتی ہے؟

۴.۵۔ تخلیق

جس طرح فلسفے میں تخلیق ضروری ہے، اسی طرح سائنس میں بھی بنیادی دلائل ''تخلیق'' ہی ہے۔ سائنسی لحاظ سے بھی ہر چیز کی تخلیق کے مختلف مرحلے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے معاملے میں ان کا وجود جنسی ملاپ کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ مردانہ نطفوں کے ننھے ننھے جراثیم، زنانہ انڈوں (بیضوں) سے ملتے ہیں۔ اور عورت کے رحم میں بارآوری کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ عمومی طور پر ایک انسان کی تیاری میں نو ماہ درکار ہوتے ہیں جس کے بعد بچہ یا بچی پیٹ سے باہر آتے ہیں۔ یہ عمل باقاعدہ مشاہداتی ہے اور علم الجُنین میں اس پر بہت تفصیلی مواد پایا جاتا ہے۔ تاہم آج کے دور میں مشاہداتی طور پر محض اتنا کچھ ہی سامنے آیا ہے۔ انسان کی تخلیق ٹھیک اسی طرح سے ہوتی ہے اور مذہبی اور لامذہبی دونوں ہی فکر میں اس پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ اختلاف اس بات پر ہے کہ سب سے اولین بار یہ تخلیق کیسے ہوئی تھی؟ اختلاف صرف پہلے آدمی کی پیدائش پر ہے نہ کہ بعد کے آنے والے انسانوں پر! لہٰذا قدرتی طور پر بحث و مباحثے کا موضوع بھی اولین انسان کی تخلیق ہی ہے۔

مذہبیوں کا دعویٰ ہے کہ اولین انسان ''آدم'' کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ جب کہ غیر مذہبی، زور دیتے ہیں کہ پہلا انسان بن مانسوں کی ترقی کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ یعنی اسے ''تخلیق'' نہیں کیا گیا تھا۔ اب دونوں طرف کے دلائل پر غور کرنا ہوگا۔ چوں کہ ڈھانچوں کی کہانی باب سوم میں بیان کی جا چکی ہے، اس لیے اب یہاں اسے نہیں چھیڑا جائے گا۔ بلکہ مختصر ترین رکھنے کی خاطر چند اہم نکات ہی بیان کیے جائیں گے۔

۶.۴۔ ذہین ترین ڈیزائن

دیکھنے والوں کے لیے کائنات میں مشاہداتی طور پر ذہانت سے بھرا ہوا انسان کا ڈیزائن ہے جو اس کی تخلیق کا خود ثبوت ہے۔ اگر کائنات کا ذہین ترین ڈیزائن ثابت شدہ ہے تو تخلیق بھی از خود ثابت شدہ کہلائی جانی چاہیے۔ کائنات میں، اگرچہ کوئی اسے ذہین ترین ہستی کی کارکردگی کہے، یا اصرار کرے کہ یہ خود ہی تخلیق ہوگئی ہے۔ بنیادی نکتہ اصل میں اس کی حیرت انگیز اکملیت ہی ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔ اسی لحاظ سے انسان کو دیکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ بھی کوئی ذہین ترین ڈیزائن ہے؟ یہ حقیقت واضح ہے کہ زمین پر موجود کسی بھی پیچیدہ ترین مشین سے بھی زیادہ پیچیدہ ترین مشین، انسان کی ہے۔ چناں چہ یہ نکتہ ہمیں نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ محض حادثے سے اتنا مکمل اور اتنا پیچیدہ و متنوع چلتا پھرتا ڈھانچہ وجود میں نہیں آسکتا۔ حتیٰ کہ دنیا کے ذہین ترین افراد مل کر بھی کوئی ایسی جیتی جاگتی چیز نہیں بنا سکتے جو انسان سے بالکل ملتی جلتی ہو۔ اگر عدم تخلیقی نظریئے کے یا جعلی قسم کے سائنسدان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان کروڑوں برسوں کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں سامنے آیا ہے، تو انہوں نے اس عمل کو آج کی دنیا میں تیز تر کیوں نہیں کر دیا تاکہ لوگوں کو مشاہدہ کروایا جاسکے کہ ارتقا کا عمل ایسا اور ایسا ہوتا ہے؟ لیکن چوں کہ ایسا نہیں ہوا ہے، اس لیے درست بات یہی ہے کہ ڈارونی نظریۂ ارتقا مصدقہ نہیں ہے بلکہ صرف مفروضات پر مشتمل ہے۔ ڈارون کی جانب سے پہلی بار پیش کیے جانے کے بعد سے آج دو سال بعد تک بھی ایسے کسی ارتقا کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ تو پھر اس کے بدلے دوسرا نظریہ آخر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ خدائی نظریہ تخلیق ہی ہے۔ اگر کسی چیز کا وجود حادثاتی طور پر اور از خود نہیں ہوا ہے، تو پھر لازماً وہ خدائے مہربان کی ذہانت کی کارفرمائی ہے

جس نے ایک ایک شے کو کامل ترین طور پر تخلیق کیا۔ چاند، سورج، ستارے، اور ہر اجرام فلکی کا اپنا اپنا ایک مخصوص گردشی دائرہ اور مخصوص وظیفہ ہے۔ خدا نے سبزہ اور سبزیاں پیدا کیں۔ پھل اگائے اور پھول تخلیق کیے جو اپنی شکل و صورت میں، خوشبو میں اور ذائقے میں ایک دوسرے قطعی منفرد ہیں۔ اللہ ہی نے یک خلیہ جاتی ''خوردبینی'' حیات پیدا کی جو اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی، لیکن اپنے وظائف کو بہت عمدگی، اور درستگی کی انتہا تک انجام دیتی ہے۔ اسی خدا نے پرندے اور جانور پیدا کیے جو رنگ، ساخت، خصوصیات، اور قد و قامت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کوئی مماثلت ہی نہیں رکھتے۔ پھر اس نے انسانوں کو بنایا۔ مذکورہ تمام اشیاء سے بالکل منفرد اور سب سے زیادہ کامل! ہر ہر پہلو سے بے مثال اور انتہائی قابل تعریف! یہی وہ تمام اوصاف و کوائف ہیں جنہیں ملا کر ایک ''ذہین ترین تخلیق'' کہا جاتا ہے۔

۷.۴۔ مقداری Quantum میکینکس

ذہین ڈیزائنر کی ایک اور قسم ''کوانٹم میکانکس'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈیوڈ Bohm جیسے سائنسدان اور معروف شخصیات مثلاً Elon Musk اور Steve Jobs نے اس بارے میں کافی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ''مقداری طبیعات'' کا مطلب، سب سے چھوٹے ذرے، ایٹم کی ساخت اور فطرت کی وضاحت ہے۔ ''بوہمی میکانکس'' سے پتہ چلتا ہے کہ ایٹم اپنی قوت نامعلوم ذرائع سے حاصل کرتے اور (آئن اسٹائن والے) عمومی Relativity کے اصول کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وضاحت ہمیں نظریہ Matrix کی طرف لے جاتی ہے۔ مثلاً کائنات کی ''ماورائے

فطرت کنٹرولڈ میکینکس''، جیسی صورت حال، یا زمین پر الیکٹرو میگنیٹکس لہریں، یا
انعطاف جیسی صورت حال! حیرت انگیز طور پر یہ نظریہ بھی ہر چیز اور ہر جگہ پر (جو
کائنات میں اپنے متعین ومقرر کردہ امورانجام دے رہے ہیں) ایک ماورائے فطرت
قبضے سے مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی ایک معمولی چھوٹی سی چیز کی حتمی تخلیق جو بعد ازاں
بڑی سطح کی تخلیق پر جا کر ختم ہو!

۵. ۴۔ عظیم ترین ڈیزائن

''اسٹیفن ہاکنگ'' نے کائنات کے لیے ایک عظیم ترین ڈیزائن کا نظریہ پیش کیا
تھا اور اس کے مقامات کی بھی وضاحت کی تھی۔ یہاں ''ذہین ترین ڈیزائن'' اور ''عظیم
ترین ڈیزائن'' کے درمیان فرق جاننا بھی ضروری ہے۔ دونوں ہی مختلف سطحوں پر تخلیق
کے قائل ہیں۔ خلاصے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ معمولی اور چھوٹی ترین Micro سطح
کی زندگی رکھنے والی اور جاندار اشیاء کی یکساں تخلیق ''ذہین ترین ڈیزائن'' کہلاتی
ہے۔ جب کہ ''گرانڈ ڈیزائن'' کا مطلب بڑی سطح مثلاً کائنات اور خلا کی تخلیق ہے۔
یہ حقیقت بہت آشکار ہے کہ کائنات ایک گرانڈ (عظیم ترین) تخلیق ہے جس کا ایک
طے شدہ پروگرام ہے۔ اور اس پروگرام کا مخصوص و متعین ہونا ہی اس کا گرانڈ ڈیزائن
ہے۔ ہر آسمانی سیارے و ستارے کو اپنا مخصوص کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ہاکسن اسے
''کشش'' کہہ کر پکارتا ہے، مگر فی الحقیقت اسے تخلیق Creation کہہ کر پکارا جانا
چاہیے، کیوں کہ چھوٹی ترین Micro کشش کو بھی عظیم دباؤ والی قوتوں کے فطری نقش
قدم ہی کی پیروی کرنی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ''بلیک ہولز'' میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اسے
چاہیں تو ہم طبعی قوتیں کہہ کر پکاریں یا خلاصے کے طور پر ''تخلیق'' کہہ لیں۔

۹. ۴۔ اولین ترین وجود (شے) کہاں سے آئی؟

ذہین ترین تخلیق اور عظیم ترین ڈیزائن، نیز کوانٹم میکانکس سے واقفیت کے بعد
اب ہم کچھ اولین ترین وجود (مادے) کے بارے میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اب
تک ہمیں بنیادی عنصر، یا ہر شے کی بناوٹ کے اصل عنصر کا پتہ لگ چکا ہے جو
Premordial (اولین) عنصر ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر اصل سوال یہ
ہے کہ اگر یہ عنصر اولین و بنیادی ہے تو وہ آخر آیا کہاں سے تھا؟ سائنسی حقیقت تو یہ
ہے کہ کوئی بھی شے خود کو از خود تخلیق نہیں کر سکتی۔ اس لحاظ سے اولین ترین
Premordial Substance کو بھی از خود وجود میں نہیں آنا چاہیے۔ پھر وہ کون
سی قوت ہے، جس سے ہر چیز وجود میں آجاتی ہے۔ کیا خدا کے سوا بھی اور کوئی نام ذہن
میں آتا ہے؟ اگر کوئی اور بھی خالق ہے تو آپ کو مذکورہ تمام سائنس پر دوبارہ نظر ڈالنی
چاہیے۔ اور اگر وہ قوت خدا ہے تو پھر یقیناً آپ نے عقل سلیم کا استعمال کیا ہے۔

۱۰. ۴۔ آسمانی کتب کا غلطی سے مبرا ہونا اور ان کے سائنسی نکات

خدا کے وجود پر سائنسی دلائل کے زمرے میں آسمانی نازل شدہ کتابیں بھی آتی
ہیں۔ اس کے موضوعات پر صدیوں سے بحثیں جاری ہیں۔ ایمان رکھنے والے انہیں
ہر لحاظ سے معجزاتی قرار دیتے ہیں۔ جب کہ ایمان نہ رکھنے والے انہیں غیر سائنسی بلکہ
سائنس دشمن قرار دیتے ہیں۔ مذہبی مجنونوں کے طرز ہائے عمل کو چھوڑ کر، کہ (جو آزاد
خیال اور لبرلز ہر طبقے میں یکساں پائے جاتے ہیں) جیسا کہ مذہبی طبقوں کے ہاتھوں
گلیلو کو انجام سہنا پڑا، اصل بات یہ ہے کہ یہ مذہبی کتابیں فی الاصل سائنس دشمن
نہیں ہیں۔ ہاں ان کی جو غلط تعبیرات کی گئی ہیں، یقیناً ان کی حوصلہ شکنی کی جانی

چاہیے، حالاں کہ تمام سامی مذاہب اور ان کی کتابیں، سائنسی مواد بھی رکھتی ہیں اور اس کی طرف راغب بھی کرتی ہیں۔ خصوصاً قرآن کریم کے بارے میں تو مسلم ہے کہ اس میں سائنس (اور اس کی اکثر شاخوں، بائیولوجی، جیولوجی، ایمبر ائیولوجی اور ایسٹرونومی وغیرہ) کے بارے میں ایک ہزار سے زائد آیات پائی جاتی ہیں۔ چودہ صدیوں سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، اس لیے اس میں عیسائیوں اور یہودیوں کی بائبل کے طور پر کوئی بھی مواد غیر سائنسی نہیں پایا جاتا۔ بائبل کے ماننے والوں نے ہر گزرتے دور میں اس میں تبدیلیاں در تبدیلیاں کیں اور خدائی الفاظ میں اپنے الفاظ بھی شامل کر دیئے۔ اس لیے اس میں سائنسی مواد کا پایا جانا لازمی نہیں ہے، بلکہ بہت زیادہ مواد غیر سائنسی ہی ہے۔

خیر اس وقت ہمارا یہ موضوع ہے بھی نہیں۔ اس کے باوجود ان کتابوں میں کچھ نہ کچھ سائنسی حقائق مل ہی جاتے ہیں۔ تاہم کسی کو اگر غلطیوں سے بالکل مبرا کوئی الہامی کتاب دیکھنی ہو تو وہ صرف قرآن ہے، اور وہی اس وقت ہمارا موضوع ہے۔

لادین لوگ اگر وجود خدا کا انکار کریں تو سائنس بذات خود اس کا کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر ان کتابوں میں سائنسی حقائق پائے ہی جاتے ہیں تو ان حقائق کو ان میں کس نے داخل کیا تھا؟ قرآن کی مثال لیں جو چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا۔ جب علوم کی اتنی فراوانی نہیں تھی۔ بلکہ بعض علوم کے بارے میں تو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں تب سائنسی حقائق کیسے داخل کیے گئے تھے؟ سائنس کا تو اس دور میں رواج ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کیتھ آئی مُور (Moore) کی مثال لیں، دنیا کا معروف ماہر ترین ایمبر ایولوجسٹ (ماہر علم الجُنین)، قرآن میں موجود ''جُنین کی آیات کے متعلق

اپنے ایک مضمون میں صاف صاف لکھتا ہے کہ:

قرآن میں انسانی جُنین اور اس کی مرحلہ در مرحلہ تبدیلی کے بارے میں وضاحتیں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں جب کہ اس کی سائنسی وضاحتیں بالکل حال ہی میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آنے لگی ہیں۔ جدید اور حقیقی تشریح میں اس قدر تاخیر کی وجوہات دو ہیں۔

(۱)......غلط ترجمے اور تشریحات

(۲)......سائنسی علوم سے عدم واقفیت

لیکن قرآنی آیات کی تشریح و ترجمے میں دلچسپی بہر حال نئی بات نہیں ہے۔ انسانی پیدائش سے متعلق آیات کے معنی، اس وقت کے لوگ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ مترجم) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست دریافت کرتے تھے، بلکہ پاپاؤں کے جوابات کی بنیاد، احادیث کی مماثلت ہی ہیں۔ قرآن بیان کرتا ہے۔

''وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔'' (۳۹:۶)

''ہمیں نہیں معلوم کہ رحم مادر میں انسانی تخلیق کے مرحلہ در مرحلہ تبدیل ہونے کے عمل میں لوگوں کی دلچسپی کب شروع ہوئی تھی؟ لیکن رحم میں جُنین کی موجودگی کا ایک تصویری خاکہ ۱۵ ویں صدی میں لیونارڈو ڈاوِنسی Leonardo Davinci نے پیش کیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں Galen نے اپنی کتاب On the Formation of the Foetus میں آنول (وہ لمبی نال جو بچے اور ماں کو پیٹ کے اندر پیوستہ رکھتی ہے۔ مترجم) اور جنین کی جھلی کے بارے میں انکشاف کیا تھا۔ اس کے بعد ساتویں صدی میں دیگر ڈاکٹروں نے کھوج لگایا کہ انسانی جُنین

دراصل رحم میں تشکیل پاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت تک انہیں اس جُنین کی اگلے درجے میں مرحلہ وار ترقی کے بارے میں معلوم نہ ہوا ہو۔ لیکن چودھویں صدی قبل مسیح میں ارسطو نے چوزے کے جنین میں مرحلہ وار تبدیلی کو بہرحال بیان کر دیا تھا۔ تاہم انسانی جُنین کی مرحلہ وار تبدیلی کے بارے میں نہ کبھی کچھ لکھا گیا تھا اور نہ کبھی اس کا تصویری خاکہ پیش کیا گیا تھا۔

سترہویں صدی میں Leeuwenhock نے جب خوردبین ایجاد کی تو چوزے کے جنین کی مختلف مرحلوں کی تبدیلی کے بارے میں انکشافات آنے شروع ہوئے۔ اس کے باوجود انسانی جنین کی افزائش کے بارے میں ۲۰ ویں صدی تک بھی معلومات صفر کے برابر تھیں۔ ۱۹۴۱ء میں Streeter نے مرحلوں کے اس عمل کو دریافت کیا جسے بعد میں ۱۹۷۲ء میں O'Rahilly نے مزید ایک بہتر وضاحت سے پیچھے چھوڑ دیا۔ (قرآنی آیت کے) تین تاریک پردوں سے مراد

(۱)......اولین پیٹ کی دیوار

(۲)......بچے دانی کی دیوار

(۳)......جنین کی بیرونی جھلی ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ ان تہوں کی اور بھی مختلف تشریحات پائی جاتی ہیں، لیکن مذکورہ تشریح جنینی علم کے لحاظ سے موزوں ترین محسوس ہوتی ہے۔ (۱)

’’قرآن میں علم الجنین کے بارے میں حوالہ جات‘‘

ایک مضمون جو Journal of the Islamic Medical Association صفحہ ۱۱۶/۱۵ پر شمارہ جنوری تا جون ۱۹۸۶ء جلد ۱۸ میں شائع ہوا تھا۔

اوپر مذکور ڈاکٹر کیتھ مور کی شائع کردہ تحقیقی تفصیل بہت سے اہم نکات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ڈاکٹر مُور نے اس بات پر صاد کیا ہے کہ ساتویں صدی میں جب کہ محمد ﷺ پر یہ قرآن نازل ہوا تھا، کسی قسم کا باقاعدہ سائنسی علم موجود نہیں تھا۔ دوئم ماں کے پیٹ میں انسانی نال کے بارے میں مختصر سی وضاحت ہے۔ اور آخری اہم بات یہ کہ ڈاکٹر کیتھ مُور نے قرآنی بیانِ جُنینیات کو سائنسی طور پر بھی درست قرار دیا ہے۔ اور نکتہ برآمد کیا ہے کہ اس دور میں جب کہ علم الجنین کے بارے میں خصوصاً کوئی سائنس موجود ہی نہ تھی اور جبکہ نبی ﷺ پر یہ قرآن نازل ہوا تھا، خصوصاً اہل عرب میں جو عمومی طور پر بالکل ناخواندہ تھے اور جس کی مثال خود محمد ﷺ ہی تھے۔ اس وقت تک تو محض بات یہی سامنے تھی کہ یہ ایک الہامی کتاب ہے جو دنیا والوں کو راہ راست بتانے کے لیے ان پر نازل کی گئی ہے۔ تو اس مرحلے پر پہنچ کر بے دین لوگوں کے پاس اب کیا انتخاب باقی رہ گیا ہے؟ یا تو وہ ان کتابوں کو من جانب اللہ سمجھ لیں اور خدا کا اقرار کر لیں۔ یا پھر حسب دستور انکار کرتے رہیں اور اپنے تمام موقف کو حتمی طور پر غیر سائنسی قرار دیتے رہیں۔ فیصلۂ انتخاب تو بہرحال منکرین خدا ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

۱۱.۴۔ وجودِ خدا کا عقلی نقطہ نظر

ڈاکِسن نے اپنے نقطہ نظر کے ثبوت کے لیے کافی فلسفیانہ دلائل پیش کیے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس کے بیان میں حقائق نہیں بلکہ محض حادثات ہیں۔ بہتر ہے کہ اس کے پیش کردہ نکات میں سے عقلی مواد کو تلاش کیا جائے۔ ’’ایک رائے‘‘ اور ’’ایک حقیقت‘‘ میں فرق تو بہرحال ناگزیر ہے۔ مگر مصنف نے اس فرق کو ملحوظ خاطر

رکھا ہی نہیں۔ دہریوں اور مذہبی دونوں کو عقلی انداز ہی سے بات چیت کرنی چاہیے۔ ڈاکِسن نے اپنے لحاظ سے عدم وجودِ خدا پر عقلی دلائل دیے ہیں لیکن یہاں ہم اس کے انہی دلائل کا فہم و دانش کی روشنی میں جائزہ لیں گے۔

۱۲. ۴۔ کیا دہریت واقعی عقل کے دائرے میں آتی ہے؟

دہریت کا لفظ ذہن میں داخلہ ہوتے ہی سوچ پیدا ہوتی ہے کہ یہ ایک دانش مندانہ نقطہ نظر ہوگا۔ کیوں کہ جب خدا کو نہ تو دیکھا، نہ چھوا، اور سنا جاسکتا ہو تو اس پر اعتقاد نہ رکھنا تو زیادہ عقل کی بات ہونی چاہیے۔ سامی مذاہب، اور اگر ذرا گہرے مطالعے میں جایا جائے تو خود ہندو مذہب کا بھی عقیدہ یہی ہے کہ خدا کو آنکھوں اور ہاتھوں سے نہیں پایا جاسکتا۔ ہندومت میں جو بت پوجے جاتے ہیں، وہ دراصل خدا نہیں بلکہ خدا کا جسمانی تصور ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات بالکل عقلی ہے کہ خدا پر ایمان محض ایک اندھا اعتقاد ہی ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دہریت ایک بالکل درست نقطہ نظر (عقیدہ) ہے۔ لیکن آیئے، اسے بھی عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

۱۳. ۴۔ فطرتی نقطہ نظر

مظاہر قدرت (فطرت) پر یقین رکھنے والوں کے ہاں طبعی قوتوں، فطری قوانین، اور طبعی قوانین کی وضاحیں موجود نہیں ہیں۔ فطرتی اعتقاد میں جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ فطری قوتوں یا ہماری فطرت کے ذریعے ہی یہ کائنات وجود میں آئی ہے تو اس صورت میں بھی یہ سوال تو بہرحال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ خود اس فطرت یا فطری قوتوں کی موجودگی کہاں سے ممکن ہوئی؟ یعنی فطرت نے کیا فطرت کو خود ہی پیدا کرلیا؟ حیرت

انگیز طور پر فطرتی نقطہ نظر میں اسی سوال کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز فطری طور پر از خود وجود میں آگئی ہے تو سب سے پہلے ہمیں اسی فطرت پر ساری توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور گفتگو کا سارا زور اس پر لگانا چاہیے۔ کیسے ممکن ہے کہ ''لاوجود'' نے ''وجود'' کو جنم دیا ہو اور پھر اسی ''وجود'' نے ''لاوجود'' کو جنم دیا ہو؟ (یہ تو ایک معمہ ہے۔ مترجم) جب انسانی یا حیوانی فطرت بھی اردگرد کے ماحول سے اثر پذیر ہوتی ہے تو کائناتی فطرت بھی اپنے اردگرد کے ماحول سے اثر پذیر کیوں نہ ہوسکی؟ جو قوتیں فطرت پر اثر انداز ہوئیں، یقیناً انہیں بامقصد بھی ہونا چاہیے۔

۱۴. ۴۔ کیا حقیقت پسندی ایک راستہ ہے؟

کیا چیز حقیقت ہے اور حقیقت پسندی کسی کو کہاں لے جاتی ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ فطری طور پر ابھرنے والی قوتیں فطری طور پر نہیں ابھرتیں۔ بلکہ وقت گذرنے کے بعد ہی وہ فطری بن سکی ہیں۔ اس ابتدائی حالت میں وہ روز اول ہی سے نہیں تھیں۔ مثال کے طور پر زمین نے اپنی کشش، الیکٹرومیگنیٹک لہریں اور اوزون کی تہیں، بہت آہستہ آہستہ ہی حاصل کی تھیں۔ فطری قوتیں ہمیشہ ہی سے یکساں نہیں رہی ہیں بلکہ ان کی ہیئت میں تبدیلیاں ایک عظیم دھماکے کے باعث ہی ممکن ہوئی ہیں۔ جنہیں ہم فطری قوتیں Natural Forces کہتے ہیں، وہ سب کی سب ''بگ بینگ'' کے بعد ہی ابھری ہیں۔ اس لیے انہیں اولین طور پری فطرت یا حقیقت کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ وضاحت کے قابل نکتہ یہی ہے کہ خود ان کی تخلیق ہی نے انہیں فطری اور حقیقی بنایا ہے۔ یوں خلاصے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی چیز فطرتی (Natural) تب ہی بنتی ہے جب وہ تخلیقی مراحل سے گذری ہو۔

۱۵. ۴۔ کیا حتمی طور پر سائنس ہی منصفانہ ہے؟

ایک سوال یہ بھی ہے کہ شروع سے آج تک انسانوں نے کیا سب کچھ سائنس ہی سے سیکھا ہے؟ اگر ہاں تو انہوں نے ڈاکسن سے پہلے تمام چیزیں کیوں دریافت نہیں کی تھیں کہ ڈاکسن کو بھی سامنے آنا پڑا اور دنیا کو خدا اور اس کے دھوکے سے آگاہ کرنا پڑا؟ اگر یہ بات نہیں ہے تو آخر پھر کیوں لازم ٹھہرا کہ خدا کو بھی سائنس ہی سے دریافت کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک بالکل علیحدہ موضوع ہے۔ اگر خدا کے ساتھ ساتھ ہر ایک بات کو بھی سائنس کی مدد ہی سے حل کرنا ٹھہرتا ہے تو پھر سائنسدان تخمینے، مفروضے، غیر ثابت شدہ نظریئے اور تجربات کیوں پیش کرتے رہتے ہیں؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے اثبات یا عدم اثبات پر سائنس کی مدد لینا ایک غیر ضروری طریقہ کار ہے، کیوں کہ سائنس بھی بہت تک محدود ہے اور اس کی اپنی بھی بعض کمزوریاں ہیں۔ کبھی نہیں ہوسکتا کہ سائنس غلطیاں نہ کرے اور خدا سے واقفیت اور الٰہیات سے متعلق بھی کوئی معقول نظریہ، مرحلہ یا سائنسی طریقہ کار سامنے لائے۔ ہر ہر اَمر کے بارے میں سائنس ہی سے آغاز کرنا اور سائنس ہی پر اختتام کرنا کوئی معقول رویہ نہیں ہے۔ ہر نظریہ اور ہر سائنس، وقت کے ساتھ ساتھ ترقی اور تبدیلی کے عمل سے ضرور گذرتے ہیں۔ اسی طرح سائنس بھی ہر روز کچھ نہ کچھ نئی واقفیت حاصل کرتی، دریافت کرتی، اضافہ کرتی، اخذ کرتی اور ایجاد کرتی ہے۔ چناں چہ اگر آج ہم اس بات پر اتفاق کرلیں کہ سائنس نے خدا کی حقیقت بالکل بھی نہیں پائی ہے اور خدا کا وجود کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوسکا ہے تو آئندہ کے متعلق بھی حتمی طور پر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں بھی سائنس کی کیفیت یہی رہے گی؟ لہٰذا اس کے بارے میں بھی سائنس

آج ہی اتنی فیصلہ کن کیوں بنے؟ کیا اس کا کوئی تعلق انسانوں کے ذاتی احساسات، پسند و ناپسند، ذہنی واسطوں اور تعلقات سے بھی ہے کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ کرسکے؟

۱۶. ۴۔ روحانیت و فطرت

فطرت کے بارے میں سب سے دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ انسانوں کے کچھ روحانی جذبات بھی ہوتے ہیں جو انہوں نے اپنے والدین سے ورثے میں حاصل کیے ہوتے ہیں۔ نہیں کہہ سکتے کہ روحانی جذبات ان کے پیش رووں کے پاس نہیں تھے مگر معمہ جاتی طور پر اب اچانک ان کے پاس داخل ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں ابتدا ہی سے کچھ روحانی تقاضے پائے جاتے تھے۔ لہٰذا اگر حادثاتی تخلیق کے فطرتی نقطہ نظر ہی کو درست تسلیم کیا جائے۔ تب بھی یہ سوال تو اپنی جگہ پر موجود رہے گا کہ فطرت اپنے ساتھ روحانیت کہاں سے لے کر آئی؟ تو کوئی نقطہ نظر اس کے برعکس آخر کیوں نہ سوچا جائے؟ صاف مطلب یہ ہے کہ انسانی ساخت کے اندر ہی روحانیت کا عنصر پیوستہ ہے اور جو ناقابل تردید ہے۔

اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے اگر نقطہ نظر یہی رکھا جائے کہ کسی چیز کو ماننے کی خاطر اس کا دیکھا اور ثابت کیا جانا ضروری ہے تو اگلے مرحلے میں لاتعداد آفاقی مصدقہ عقائد و حقائق کے بارے میں مشکلات سامنے آنے لگیں گی۔ ہوا ایک حقیقت ہے، اس کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں۔ مرحلہ تب درپیش ہوتا ہے جب ہم سوال کریں کہ کیا اسے کسی نے دیکھا بھی ہے؟ ضرور کہ اس کی رفتار کو متعلقہ پیمانے سے ناپا جاسکتا ہے، مگر اصل سوال یہی ہے کہ کیا اسے کسی نے دیکھا بھی ہے؟ یہی تو ہمارا بنیادی نکتہ ہے، تو کیا ہم صاف صاف کہہ دیں کہ چوں کہ اسے دیکھا نہیں

جا سکتا، اس لیے ہوا موجود ہی نہیں ہے؟ اسی ضمن کی دوسری مثال درد کی ہے۔ انسان اس کی تکلیف کو محسوس تو کر لیتا ہے لیکن کہیں سے دیکھ نہیں سکتا، بلکہ اکثر اوقات تو اس کی شدت کو کسی پیمانے سے ناپا بھی نہیں جا سکتا۔ تو کیا اب یہ حکم لگایا جائے کہ درد کا بھی کوئی وجود نہیں ہے؟ لہٰذا اس مختصر سی بحث سے، جو ضروری حقیقت سامنے آئی، یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود یا عدم وجود کی خاطر محض اس کا دیکھا جانا ہرگز بھی واحد معیار نہیں بن سکتا۔

اچھا تو کیا کسی چیز کا سنا جانا اس کے وجود کے دلالت کر سکتا ہے؟ جواب بہت سادہ ہے۔ خلا میں کسی بھی چیز کی آواز نہیں سنی جا سکتی۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلا میں کوئی بھی چیز وجود نہیں رکھتی؟

اس کے بعد تیسرا مرحلہ چیز کے چھوئے جانے کا ہے۔ لو! وہ سورج ہے۔ اسے آپ ہرگز بھی نہیں چھو سکتے۔ لو! اب وہ بھی اپنا وجود کھو بیٹھا! یہ تو بہت سادہ سی بات ہے۔ چناں چہ کسی چیز کا دیکھا جانا، سنا جانا اور چھوا جانا بھی اس کے وجود کے بارے میں حتمی دلیل نہیں بن سکتا! تو پھر حتمی طریقہ کار کیا ہو؟ اگلے چند پیراگراف میں اس کی نسبتاً تفصیلی وضاحت آئے گی۔ لیکن فی الوقت تو ہم اس سوال پر بحث کر رہے ہیں کہ آیا دہریت عقل میں آنے والی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں؟

دہریت یا انکارِ خدا کا سب سے بڑا عقیدہ ''ارتقا'' ہے۔ ''ڈارونی ارتقا''۔ دہریئت میں اسی وجہ سے یہ عقیدہ رکھا جاتا ہے کہ چوں کہ انسانی زندگی، دیگر زندگیوں اور موجودات کے عمل و ردعمل کے نتیجے میں سامنے آئی ہے، اس لیے خدا کا درمیان میں ہونا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ یہی نقطہ نظر وہ ''دھماکۂ عظیم'' Big Bang کے بارے میں بھی رکھتے ہیں کہ یہ دھماکہ بھی محض ایک اتفاقی حادثے کے نتیجے میں ہوا تھا، جس

کے بعد یہ ستارے، آسمان اور دیگر اجرام بھی حادثاتی طور پر ہی وجود میں آئے۔ خدا کا تو اس میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موقف کو بہتر سمجھنے کی خاطر ضروری ہے کہ ایک مالک اور ملازمین کے تفویض شدہ وظائف کے بارے میں بھی مناسب معلومات حاصل ہوں۔ کسی ادارے میں ملازمین کو بعض متعین امور باقاعدگی سے دیے جاتے ہیں، جب کہ نئے ملازمین کی بھرتی اور قدیم ملازمین کی رخصتی کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ادارے کے معمولات بغیر کسی رکاوٹ کے پرسکون انداز سے روزانہ جاری رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس مثال میں مَیں نے ادارے کے سربراہ کا نام بھی نہیں لیا۔ یعنی میں نے اس کی اہمیت کا آپ کو احساس ہی نہیں دلایا۔ اس کے باوجود تمام معمول، روزانہ کی بنیاد پر پُرسکون طور پر رواں دواں رہے۔ باس کا ذکر نہ کروں تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنا کوئی وجود رکھتا ہی نہیں؟ معمولات کا جاری رہنا تو بعد کی بات ہے، پہلے تو یہ بتائیں کہ وہ ادارہ وجود میں کیسے آ گیا؟ ادارہ کس نے بنایا؟ اور کس نے اس کا ابتدائی عملہ بھرتی کیا تھا؟ قدرتی طور پر اس ادارے کا کوئی مالک/سربراہ بھی ہے۔ اس نے سرمایہ کاری بھی کی ہے۔ اسی نے ادارے کی تخلیق بھی کی ہے، اور اسی نے بنیادی عملے کا انتخاب بھی کیا ہے۔ اب اگر وہ بذاتِ خود وہاں کام نہ بھی کرے (گھر بیٹھا رہے۔ مترجم) تب بھی ادارہ خود بخود چلتا رہے گا۔ اس کے ثمرات بھی ملتے رہیں گے، اور نہ موجود پاتے ہوئے بھی ادارہ ''اسی'' کا کہلائے گا۔ آخر کوئی یہ کہنے کی کیسے ہمت کر سکے گا کہ چوں کہ اتنے بڑے ادارے کے مالک کو میں نے کبھی نہ تو دفتر آتے دیکھا اور نہ کام میں مصروف پایا۔ اس لیے وجود محض واہمہ اور دھوکا ہے؟ ایسے شخص کو پھر لوگ احمق ہی کہہ کر پکاریں گے!

سوجھ بوجھ رکھنے والوں کا خاکہ دکھانے کے لیے ایک کھلنڈرا آدمی بھی کافی

ہے۔ البتہ مکمل تصویر کا جائزہ لینے کے لیے آپ کو کینواس اور اس کی صفت کا بھی جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے اور تصویر کی درجہ بندی کی خاطر دلائل کا معیار بھی جانچنا ضروری ہے۔ دہریت کا کینواس بہت باریک سطح کا ایک کاغذ ہے جو تیز ہوا سے آسانی سے پھٹ سکتا ہے۔ اس صورت میں جب کہ فکری مرحلے میں دہریت کی گہرائی بہت کم ہے اور وہ گمنام لوگوں کے بعض منتشر خیالات پر مبنی ہلکا سا کاغذ ہی ہے؟ تو انہیں کسی لحاظ سے بھی عقلی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۷. ۴۔علمیات میں ڈاکِسن اور ڈارون کے نظریات کا مقام کیا ہے؟

خلا سے متعلق دلائل سے قطع نظر، جو مسئلہ تخلیق پر محض مبہم ہیں، خدا کے وجود اور اس کی تخلیق پر ڈاکِسن اور ڈارون کے نظریات کا مقام سلسلۂ علمیات میں کیا ہے؟ اس بات پر ہمیں اتفاق کر لینا چاہیے کہ خدا کے بارے میں ان دو حضرات نے جو دلائل دیے ہیں، بالکل ناکافی ہیں۔ ڈاکِسن نے عمومی طور پر سماجی دلائل کے علاوہ کچھ اور نہیں پیش کیا ہے جو کوئی علمی دلیل ہے ہی نہیں۔ اس سے قبل ڈارون نے بھی محض ایک مفروضہ پیش کیا تھا، علمی دنیا میں جس کا بھی کوئی مقام نہیں ہے۔ مفروضات کی جانچ کرنے اور انہیں درست تسلیم کرنے کے طریقہ کار سے دور دور تک بھی اس کا واسطہ نہیں ہے، بلکہ درست بات تو یہ ہے کہ ڈارون کا پیش کردہ نظریۂ ارتقا محض ایک حیاتیاتی Biological سائنس ہے، نہ کہ الٰہیات یا مطالعۂ خدا! اگر ہم وقتی طور پر ڈارون کے نظریئے سے سو فیصد اتفاق بھی کر لیں، تب بھی یہ محض ایک علم حیاتیات Biology ہی ہے اور گھومتا بھی وہ سائنس کی اسی شاخ کے گرد ہے۔ لہٰذا اس میں خدا کے وجود و عدم وجود کا معاملہ کہاں سے داخل ہو گیا؟ خاص خدا کے بارے میں تو اس

ارتقائی نظریئے میں کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ سائنس کے کسی ایک شعبے سے دلائل لے کر دوسرے شعبے پر چسپاں کر دینا آخر کون سا طریقہ کار ہے؟ تحقیق کسی اور بارے میں ہو اور نتیجہ کسی اور کے بارے میں نکالا جائے۔ یہ کوئی دانش مندی تو نہیں ہے؟ سلسلۂ علمیات میں کیا اس کو کوئی وزن بھی ہے؟

۱۸. ۴۔علم الطیّور (پرندوں کی علمیات) میں وہ کہاں کھڑے ہیں؟

ڈاکِسن نے اپنے موقف کے ثبوت کے لیے بے شک علم الطیّور کی بھی کچھ مثالیں پیش کی ہیں، لیکن کیا ان کی بنیاد پر خدا کا رد کر دینا درست ہے؟ کیا اس کی وجہ سے ہم حتمی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا وجود دھوکہ ہے؟ درست یا نادرست ثابت کرنے کا یہ کون کا طریقہ ہے؟ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ محض مفروضوں اور خیالات کی بنیاد پر کسی ثابت شدہ حقیقت (خدا) کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی مشق ایک بیکار محض ہے۔ پرندوں کے علم کی بنیاد بھی اس بارے میں کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتی۔ ایک تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے کسی دوسرے یا تیسرے فریق اول کی شمولیت ہی مدلل بنا سکتی ہے، جو اس خاص معاملے میں خدا تعالیٰ ہے۔ اس لیے اس پر گفتگو کرتے ہوئے آپ کو اسی کے الفاظ (آسمانی کتابوں) پر انحصار کرنا ہوگا۔ ایس کے الفاظ پر آراء پیش کریں اور اسی کے متن پر تبادلہ خیال کریں۔ مگر یہ کیا کہ آپ ''ایسا ہی ہوگا'' اور ''ایسا نہیں ہوگا'' کہتے چلے جائیں اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھٹکتے پھریں۔ یہ تو صرف ہوا میں تیر چلانا ہی ہوا۔

۱۹. ۴۔ دہریت پر دلائل دیتے ہوئے درست برعکس لفظ الٰہیات ہے نہ کہ مذہبیت! مذہبیت تو بس لامذہبیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

لیکن خدا پر ایمان رکھنے والوں کے لیے مناسب الفاظ الٰہیات، ایمان اور فلسفہ ہیں۔ یہ حقیقت کہ کائنات کا انتظام چلانے والی کوئی ہستی (خدا) بھی ہے اور اسی مافوق الفطرت ہستی نے اس کی تشکیل بھی کی ہے۔ پھر مافوق الفطرت ہستی کے بارے میں معلومات بھی ہمیں نزول شدہ الہامی کتب ہی سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ یہ لوگوں کے ذاتی خیالات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ سامی مذاہب کے پیغمبروں پر نازل ہونے والی کتابوں پر اعتقاد کا مجموعہ ہے۔ الٰہیات کو سادہ طریقے سے سمجھنے کی خاطر ایک سائنسی مثال بہت عمدہ ہوگی۔ DNA کا وجود اگرچہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، لیکن آخر کتنے لوگوں نے اس ڈی این اے کو بچشم خود دیکھا ہے؟ (ڈایا گرام والا ڈی این اے بھی اصلی ڈی این اے نہیں ہے)۔ جینیٹکس سے متعلق چند افراد کے سوا جنہوں نے اس کی باریک جھلیوں کو بذات خود دیکھا ہے، باقی عوام نے اس کے بارے میں صرف سنا ہی سنا ہے۔ اس کے باوجود ایک ایک فرد یقین رکھتا ہے کہ ڈی این اے بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کا تذکرہ جینیٹکس کے شعبے سے متعلق ماہر افراد نے کیا ہے جن کی صلاحیتوں پر ہم سب بھروسہ کرتے ہیں۔ الٰہیات کا مسئلہ بھی اس سے ہرگز الگ نہیں ہے۔ الٰہیات کے ماہرین، یعنی انبیائے کرام نے ہمیں اس کے بارے میں یقین دلایا ہے، جو زمین پر سب سے زیادہ قابل اعتماد حضرات تھے۔ اگر ڈی این اے کے پُراعتماد ماہرین کی بات کو بسروچشم تسلیم کرنا درست ہے تو اس دوسرے پُراعتماد ذریعے کی گواہی کو بسروچشم تسلیم کرنا کیسے غلط ہوسکتا ہے؟

۲۰.۴۔ کائنات کی تشکیل کے معاملات سے متعلق امور کے بارے میں عملِ تخلیق اور ماہرین تخلیق بالکل واضح نظریات رکھتے ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ ''زمانے کو برا بھلا مت کہو، کیوں زمانے کو بھی اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔''

کائنات کو منظم رکھنے کے بارے میں طبعی وطبیعیاتی (Physical) قوانین کے علم کی یہ ایک بہت عمدہ مثال ہے۔ برفانی دور (Ice Age) سے قبل کے ہونے والے واقعات کے ضمن میں بھی یہ ایک بہت عمدہ نقطہ نظر ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر تخلیق پر یقین رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ''ناچیز'' (Nothing) کو کس طرح وجود میں لایا گیا تھا۔ مظاہر پرست اگرچہ اس کے بعد کے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بہت کچھ تفصیل سے بیان کرتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ ''وجود'' (آغاز) ہوا ہی کیسے تھا؟ جب کوئی ہستی ہے جس نے فطرت Nature کو پیدا کیا ہے تو اس کا سادہ مطلب یہی ہے کہ فطرت Nature بھی ایک تخلیق ہے۔ اس مقام پر تخلیق پر ایمان رکھنے والے، ان لوگوں پر ایک درجہ فوقیت رکھتے ہیں جو کہتے ہیں کہ سارا کارخانہ محض ناگہانی طور پر سامنے آ گیا تھا اور باقی ہر چیز بعد میں آئی ہے (جس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ ''کیسے؟'')۔ تو پھر اس موقع پر آپ خود اپنے آپ سے معلوم کریں کہ کیا واقعی آپ کوئی دانش مندانہ بات کررہے ہیں؟

دوسری جانب ڈاکِسن کے پیش کردہ دلائل ان لوگوں کے خلاف بھی لائے جانے لازمی ہیں جو اس کی دہریت کو ثابت کرتے ہیں۔ ڈاکِسن نے ماضی کے چند حضرات البرٹ آئن اسٹائن، تھامس جیفرسن، Sean O' Casey اور وکٹر ہیوگو کے بعض اقوال نقل کیے ہیں۔ مصنف نے اپنے دسوں ابواب کا آغاز انہی کے اقوال سے کیا ہے۔ چناں چہ ضروری ٹھہرا ہے کہ ان کے اقوال کا ایک جائزہ لیا جائے کہ کیا انھوں نے کیا کہا تھا اور ان کی اصلیت کیا تھی؟

سب سے پہلے آئن اسٹائن ہے جس کے کندھے کو اس نے گولی چلانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ آئن اسٹائن کے اپنے الفاظ یہ تھے۔ ''لیکن جو بات مجھ

میں غصہ پیدا کرتی ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ (تھیسٹس) اپنے نظریات کی تائید وحمایت کی خاطر میرے اقوال کا استعمال کرتے ہیں۔'' ایک دوسرے مقام پر اس نے کہا کہ ''میں ملحد (اتھیسٹ) نہیں ہوں۔''(۲) (Ronald N. Clark, Einstein: The Life and Times. New York World Publishing Company: 19/1-425)

اس لیے ہم نے دیکھا کہ جس ٹوکری میں ڈاکسن نے تمام انڈے جمع کیے تھے، وہ ٹیک ہو رہی ہے۔ آئن اسٹائن تو ان پر غصے کا اظہار کر رہا ہے جو اسی کے قول سے اسے دہریہ ثابت کرتے ہیں، اور دوئم دوٹوک طریقے پر وہ کہتا ہے کہ وہ دہریہ فرد نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کے بیانات کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟

دوسری اہم شخصیت جسے بہت زیادہ سامنے لایا جاتا ہے، تھامس جیفرسن کی ہے۔ اس کے نظریات کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ ایک موحد عیسائی تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان رکھتا تھا لیکن خدا یا خدا کا بیٹا تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ مسلم عقیدے کے بالکل قریب تھا۔ ڈاکسن کو چاہیے کہ اگر وہ جیفرسن کے اقوام کو سند کے طور پر لانا ضروری سمجھتا ہے تو پھر اس کے عقیدے کو بھی قبول کرے۔

تیسری شخصیت جس کے اقوال کو وہ پیش کرتا ہے، وہ Sean O' Casey ہے جسے ذاتی طور پر مذہبی علم سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ بس ایک ڈرامہ نویس تھا۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس کے اندر علم کی کمی بھی تھی کیوں کہ تاریخ کے بارے میں وہ ایک عجیب بات کہتا ہے کہ اگر سیاست نے ہزاروں لوگوں کو ہلاک کیا ہے تو مذہب نے بھی لاکھوں لوگوں کو تہہ تیغ کیا ہے۔ تاریخی حقائق کیا ہیں؟ اس کے لیے آیئے ہم پیغمبروں کا ذکر کریں جن کے امتی دنیا کی آبادی پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور

حضرت محمد ﷺ! اس مرحلے پر ڈاکسن اپنے آپ سے خود سوال کرے اور اپنے آپ سے خود جواب حاصل کرے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں کتنی جنگیں کی تھیں اور کتنے لوگ ان کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے؟ یقیناً اس کا جواب صفر ہی ہوگا۔ دوسرے نمبر پر حضرت محمد ﷺ ہیں جنہوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو تاریخ شاہد ہے کہ تمام جنگیں انہوں نے محض اپنے دفاع میں لڑی تھیں۔ ذاتی دفاع تو ایسا حق ہے جسے جدید دنیا بھی تسلیم کرتی ہے۔ مزید یہ حقیقت بھی کہ آپ ﷺ کے ہاتھوں لڑی گئی جنگوں میں مجموعی طور پر جو جانی نقصان ہوا تھا، وہ ایک ہزار افراد سے زیادہ کا نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں ذرا جنگِ عظیم اول کی انسانی ہلاکتوں کو دیکھیں تو ان کی تعداد ۴ کروڑ ہے، جبکہ جنگ عظیم دوم میں یہ تعداد بڑھ کر ساڑھے آٹھ کروڑ ہوگئی تھی۔ (حوالہ وکی پیڈیا) (۳) یہ دونوں عالمی جنگیں اصل میں کس رنگ کی تھیں؟ مذہبی یا سیاسی؟ ویسے بھی اگر آپ اب تک کی تمام مذہبی جنگوں کی مجموعی ہلاکتوں کو دیکھیں تب بھی وہ دوسری جنگ عظیم کی ہلاکتوں سے بھی کم ہوں گی۔ پس ثابت ہوا کہ Casey نے حقائق بالکل غلط پیش کیے ہیں۔

آخر میں آیئے ہم وکٹر ہیوگو کے خیالات بھی جان لیں! محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکسن کو پادریوں کے ساتھ کچھ مسئلہ درپیش ہے۔ لہٰذا اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ فردِ واحد کے عمل کو پورے معاشرے کا عمل قرار دینا درست نہیں ہے۔ کلیسائی ذمے داروں کی غلط حرکتوں کی بنیاد پر تمام مذہبی اقوام کی بدنامی کرنا بالکل غلط طریقہ کار ہے۔ کسی کمپنی کے واحد ملازم کی کی گئی غلط کاری کو پوری کمپنی کی غلط کاری قرار دینا کیا درست صورت ہوگی؟ اگر اتنی عام فہم بات کو بھی بہت وضاحت سے سمجھانے کی ضرورت ہو تو میں نہیں کہہ سکتا کہ دنیا کہاں جا رہی ہے؟

اگر معمولی سی عقل بھی نہ ہو تو گونگا ہونے کے علاوہ انسان اور کیا چیز ہے؟

ڈاکسن کے جوابی دلائل کی طرف آتے ہوئے، جو اقوال اس نے اپنے ہر باب کے آغاز میں پیش کیے ہیں، تو جوابی طور پر ہم بھی ایسے ہی دس اقوال پیش کر سکتے ہیں، جن میں وزن بھی بہت ہے۔

۱۔ طبعی رفطری فلسفیوں کے پیش کردہ نظریات

''تقدیر'' پر ایمان رکھنے کے بجائے بہتر ہے کہ خدا کے بارے میں بیان کی گئی داستانوں پر یقین کیا جائے۔ اگر خدا واقعی موجود ہے تو چند عبادتوں کے ساتھ اسے بہر حال خوش بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا نہیں ہے تو پھر ہم ایسے عناصر کی ماتحتی میں ہیں جنہیں کبھی کوئی خوش نہیں کر سکتا۔ (ق م ۳۰۰، Epicurus۔ اپی قور)

پس ظاہر ہوا کہ خدا موجود نہ ہو تو دنیا سوائے مقام ظلم کے اور کچھ نہیں ہے، جہاں عدل کا نہ تو ولولہ ہے، نہ امید اور نہ اچھے کاموں کا کوئی صلہ! بس برے اعمال کی سزا ہی سزا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دور قدیم کے فلسفی بھی اس نکتے کو جانتے تھے۔ لیکن دور جدید کے عالم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس مرحلے پر البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس دور میں خدا پر ایمان رکھنے کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں تھا، لیکن آج کے دور میں عقل زیادہ روشن ہوگئی ہے اور ان کے پاس سوچ کے متبادل راستے بھی موجود ہیں۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر موجود ہے کہ وہ متبادل راستے آخر کیا ہیں؟ خدا کو مسترد کر دیں اور معاشرے کے باغی ہو جائیں؟ ڈارونی نظریئے پر ایمان رکھیں اور باقی نظریات سے منہ پھیر لیں؟ مگر ان سے منہ پھیرنے کی بھی تو کوئی بنیاد اور کوئی سبب

ہوگا؟ بس یہ کہ ''یہ نظریہ ہمارے ذہن کو اچھا لگتا ہے اور وہ نظریہ اچھا نہیں لگتا؟'' محض افسانوں پر یقین کرنا اور خدا کے وجود پر کائناتی شہادتوں کا انکار کرنا کیا کوئی دانش مندی ہے؟ یا محض نفرت؟ مردم بیزاری والی نفرت؟ اس مردم بیزاری یا Misanthropy کو وکی پیڈیا میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

''انسانی فطرت یا نوعِ انسانی کی توہین، عدم اعتماد، ناپسندیدگی اور عمومی نفرت۔ ایک Misanthrope یا Misanthropist شخص وہ ہوتا ہے جو مذکورہ قسم کے نظریات یا احساسات رکھتا ہے۔'' (۴) (حوالہ: وکی پیڈیا)

۲۔ ''میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ (مذہب) لوگوں کے لیے ایک اہم ترین عنصر ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ اسے کیوں اہم ترین ہونا چاہیے؟ مذہب انسان کو نہ صرف ذاتی پرورش کا سامنا مہیا کرتا ہے بلکہ مضبوط تعلق اور شخصیت کے اظہار کے ذرائع بھی فراہم کرتا ہے جو عموماً بہت قیمتی عناصر ہیں۔ میرے نزدیک اس میں کوئی غلط بات بھی نہیں ہے۔'' (نوم چومسکی۔ ایک انٹرویو میں اظہار خیال) (۵)

نوم چومسکی، امریکی ماہر لسانیات، ہارورڈ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور اپنی کتابوں و تحریروں کے سبب سب سے معروف عالمی شخصیت ہیں، بلکہ انہیں دنیا کے تین سرفہرست عالمی دانشوروں میں سے ایک کا درجہ بھی دیا گیا ہے۔ خدا کے بارے میں انہیں بھی شک رکھنے والا ''لا اَدری'' فرد جانا جاتا ہے، جب کہ ان کے خیالات بیشتر لحاظ سے مذہب کی حمایت میں بھی نہیں پائے جاتے۔ اس کے باوجود روحانیت اور مذہب کے بارے میں ان کے نظریات بالکل واضح اور دوٹوک ہیں۔ یہ کہ اگر کچھ یا بیشتر لوگ اگر اس راستے کو اختیار کرتے ہیں تو اس معاملے میں کسی کو فکرمند نہیں ہونا

چاہیے۔اس حقیقت پر وہ بالکل واضح ہیں کہ روحانیت نے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا ہے اور زندگی کا وہ ایک اہم جز بھی ہے۔لہٰذا جب دنیا کا دانشور ترین فرد جو خود بھی مذہب پر عمل سے دور ہے، اس کے باوجود مذہب پر عمل کرنے والے لوگوں سے اسے پریشانی نہیں ہوتی اور پھر دوٹوک اور واضح طریقے سے وہ اقرار بھی کرتا ہے کہ مذہب کی راہ اختیار کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اکثر اوقات اس سے مفید نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔تو پھر ڈاکِسن کو مذہب سے پریشانی کیوں لاحق ہوتی ہے؟ خدا اور مذہب پر وہ کیوں مسلسل زبان دراز کیے رہتا ہے؟ لوگوں کو سکون کی حالت میں رہنے کیوں نہیں دیتا؟ ان کی زندگی سے سکون کو کھینچ نکال لینے کے کیوں درپے رہتا ہے؟ لوگوں کی ذاتی زندگی میں دخل دینے سے کیوں باز نہیں آتا؟ اور ان کی زندگی کے حساس ترین پہلو کو چھیڑنے میں کیوں مشغول رہتا ہے۔''

۳۔''اسرائیل کا خدا صرف ایک نسلی خدا نہیں ہے بلکہ ایسی ہستی ہے جو دنیا کی خالق ہے او انسانیت عالم سے جسے خوب دلچسپی ہے۔'' Emil L. Fackenheim (God's Presence in History)(۶)

اب ذرا ایک جھلک خدا کے سیاسی روپ کی بھی ہوجائے۔''فیکنہم'' یہودی ہولوکاسٹ (جنگ عظیم دوم) کا زندہ بچ جانے والا فلسفی ہے۔مذہب کے بارے میں اس کی تحریر خاصی تنقید لیے ہوئے ہوتی ہیں۔جس کے نزدیک خدا کا نام لینے اور دنیا میں جنونی حیثیت اختیار کر لینے سے صورتحال کبھی کبھی بہت خطرناک بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مانتا ہے کہ خدا کا وجود ایک تسلسل ہے۔خدا (اس کے لحاظ سے یہودی خدا) ہر ایک کے بارے میں فکرمند رہتا ہے۔ ہر ایک چیز پر نظر رکھتا ہے، اور بیک وقت کل انسانیت کا نگران ہے۔ چناں چہ ایک شخص جس کی فلسفیانہ حیثیت مسلم

ہے، جس نے مذہبی شدت پسندوں کے ہاتھوں بہت ظلم سہے ہوں اور جو جیل میں بھی رہا ہو، وہ بھی خدا کا دفاع کر رہا ہو تو ڈاکِسن کو ایسی ضرورت کیا لاحق ہوگئی تھی کہ وہ خدا کے خلاف فکری جنگ کرنے لگے جب کہ خدا نے اسے کسی بھی لحاظ سے نہ تو کوئی نقصان پہنچایا ہو اور نہ جسمانی طور پر اسے کبھی پریشان کیا ہو، جیسا کہ مذہب کے ہاتھوں بعض لوگوں کے ساتھ مصائب سامنے آتے رہے ہیں؟ کیوں نہ وہ بھی انہی کی طرح مثبت رویہ اختیار کرنے اور خدا کی حمایت میں آواز بلند کرنے لگے؟ اپنی ذات کے لیے نہیں تو کم از کم اپنے گرد موجود انسانوں کی خاطر ہی!

۴۔''ہماری اصل کو خدا کی انسانی پیدائش کے اصولوں کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔اسی شکل میں جو اس کی عین مرضی رہی ہے اور ان تمام ترقیاتی مرحلوں کے مطابق جو حیاتِ انسانی کی تاریخ کے لحاظ سے واقع ہوتے رہے ہیں، اس نقطہ نظر کے ساتھ ہی ہم اس امکان کو بھی رد نہیں کر سکتے کہ ایک یا ایک سے زائد جدید انسانوں کے پیشرو کی نسل (کامل طور پر ترقی یافتہ انسانی مجموعے) خدا کی تخلیقی ذہانت کے نتیجے میں بعض جینیاتی ردوبدل کے باعث ہی سامنے آئے ہوں۔'' Dr. Maurice Bucaille What is the Origion of Man? P.199-200(۷)

فرانسیسی ڈاکٹر مارس بوکیل نے اپنی کتاب What is the Origion of Man? میں انسانی اصل اور اس کی بنیاد پر گفتگو کی ہے۔ڈاکٹر کی فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ اکمل ترین انسانی ذات بغیر کسی الٰہی مداخلت کے جنم لے ہی نہیں سکتی۔اگرچہ اس نے تخلیقی مرحلوں پر بھی سوالات اٹھائے ہیں، لیکن اس نظریے کی توثیق کیے بغیر نہیں رہا ہے کہ ہر چیز کو اس کی کامل اور اعلیٰ ترین حالت میں خدا ہی نے منظم کیا ہے اور یقینی طور پر اپنی موجودہ شکل وصورت میں انسان خدا کی جانب سے آسمان سے براہ

راست آیا ہے۔ ایک سائنسدان کی جانب سے آنے والے اس تصور نے تخلیق مخالف عناصر کے افکار پر زبردست چوٹ لگائی ہے کہ کیا تمام تخلیقی سوالات کا حل واحد لفظ ''خدا'' میں پوشیدہ ہے۔ یہ وہ حل ہے، جس کی تائید اعلیٰ پائے کے ماہرین نے بھی کی ہے۔ منکرین پر اب لازم ٹھہرتا ہے کہ یا تو اپنے نظریات پر اٹھنے والے ''اگر اور کیوں؟'' کے جوابات دیں یا اقرار کرلیں کہ خدا موجود ہے۔

۵۔ خلیات کے طرزِ عمل کے کنٹرول کے بارے میں کسی کو جب پروگرام کی ضرورت درپیش ہوتی ہے تو مسئلہ وہیں الجھتا ہے۔ ہر وہ شخص جسے ایک عام کمپیوٹر کے بارے میں درست اور پیچیدہ پروگرام تشکیل دینا ہو۔ (بنیادی کمپیوٹر زبان Basic یا Fortran کے استعمال کے بغیر) تو تجربے کی بنیاد پر ہمارا خیال ہے کہ وہ اس حقیقت سے ضرور اتفاق کرے گا کہ Sub-routines کا لکھا جانا اس عمل کا سب سے کم تر حصہ ہوتا ہے۔ اصل اور مشکل عمل تو ''ہارڈ پروگرام'' کی منطق (Logic) میں درپیش ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کے معاملے میں بھی Histones اور، enzymes محض Sub-routines ہیں اصل اور مشکل پروگرام کو سب سے پیچیدہ حصہ، مرکزی رینڈم پروسیس سے دریافت ہونا ہے، نہ کہ مجموعی Complex مواد سے، جس پر ہمارے امکانی اندازے بنیاد رکھتے ہیں۔ صرف ایک حصے 10^40,000 سے بھی کم! (Fred Hoyle-Chandra Wickrama singhe

(Evolution From Space. P 141)(۸)

ماہر نجومیات سر Fred Hoyle (جس نے ستاروں کی جوہری ترکیبی نظریئے میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے) اور طلائی تمغہ حاصل کرنے والے ماہر نجومیات، ریاضی دان اور کارڈیف یونیورسٹی (ویلز) کے پروفیسر چندرا وکرما سنگھ

(جس نے ستاروں کے درمیان غبار کے (Inter Stellar Matter) کے قواعد و ضوابط پر کام کی بدولت عالمی شہرت پائی تھی) دونوں ہی حضرات نے مادے کے خلائی اور خلیاتی امور پر ایک مشترکہ کتاب Evolution from Space لکھی تھی۔ انہوں نے آخر میں یہی کہا تھا کہ انہوں نے یہ کتاب ڈارون کے نظریہ ارتقا کے خلاف لکھی ہے۔ بالکل ابتدائی مادے کے آغاز کے مثالیں دیتے ہوئے انہوں نے واضح کیا تھا کہ امینو ایسڈ میں سے پروٹینز سب سے پہلے کیسے تیار ہوئے تھے اور بعدازاں Amino Acids کا ڈھانچہ اور ساخت کیسے وجود میں آئے؟ انہوں نے انکشاف کیا کہ جین کی ابتدائی پروگرامنگ دنیا کے باہر سے آئی تھی (بمعنی خدا سے)۔ اس کے ثبوت کے لیے انہوں نے کمپیوٹر کی ''زبان پروگرام'' کی مثال دی تھی، جو نہ تو از خود وجود میں آتی ہے اور نہ از خود اپنی پروگرامنگ کرسکتی ہے، بلکہ یہ دونوں کام باہر بیٹھے پروگرامر ہی کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ عظیم الشان کام ڈاروینی فکر ارتقا کے لیے بہت بڑا جھٹکا اور اس کے دعووں کی تردید ہے۔

۴۔ ایک ماورائے عقل ہستی کا وجود ہی لامتناہی مطابقت Adiustments سے ظاہر ہوتا ہے جس کے بغیر خود زندگی کا وجود بھی ناممکن ہے۔ زمین پر انسانی موجودگی اور اس کی عظیم الشان ذہانت، اس پروگرامنگ ہی کا حصہ ہے، جو ماورائے فکر، عظیم ہستی کی دانش چلا رہی ہے۔ A. Cressy Morrison

(Man Does Not Stand Alone. P.9)(۹)

اس امریکی کیمسٹ اور صدر نیویارک اکیڈمی آف سائنسز کا نام Cressy Morrison ہے، جس نے Man Does not Stand Alone نامی ضخیم

کتاب لکھی تھی۔ اس میں اس نے ثابت کیا کہ ایمان، خود سائنس سے بھی ثابت ہے۔
ماریسن کے مطابق سائنس اور سائنسی تجربات بھی خدا پر ایمان کو ثابت کر سکتے ہیں جن
سے ہمیں زمین پر زندگی اور کائنات کے تخلیقی عمل کے مختلف اجزا کی معلومات حاصل
ہوتی ہیں۔ چناں چہ یہی بنیادی معلومات ہمیں اپنے خالق، خدا کے علم کی طرف بھی
رہنمائی کرتی ہیں۔ اس سے متعلق وہ ہمیں سائنس کے مختلف شعبوں، نجومیات، کیمسٹری
اور جینیٹکس سے مثالیں پیش کرتا ہے۔ اس کا یہ کام ۱۹۴۰ء میں ڈارو ینی نقطہ نظر کے
فوراً بعد سائنس اور مذہب کی دنیا میں ایک بڑا داخلہ تھا۔ اس دَور تک مذہب کا سائنسی
بنیادوں پر کوئی کام سامنے نہیں آیا تھا، مگر مارلیسن وہ اولین فرد تھا جس نے اس پہلو پر
کام کیا تھا اور جس ضمن میں کام تا حال جاری ہے۔ ڈارون کے خیالات کو تب تک
صرف ایک سال ہی گذرا تھا۔ اور جب اس کا انتقال ہوا تو ڈارون کے نظریئے کی عمر
دس سال ہی ہو سکی تھی۔ تصور کریں کہ ڈاکسن دعویٰ کرتا ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا
کے بعد ہی خدا پر عقیدے کا سائنسی انحطاط ہوا تھا۔ یاد رہے کہ مارلیسن کی کتاب
سامنے آنے تک آئن اسٹائن زندہ تھا اور امریکہ منتقل ہو چکا تھا۔ پھر کیا ڈارون محسوس
نہیں کرتا تھا کہ اس کے بعد خدا پر اعتقاد سائنسی بنیادوں پر دوبارہ بحال ہو چکا تھا؟

۷۔ ''کارکردگی کی بنیادوں پر حتمی تخلیقی امور کی نگران، خدا کی ذات ہی تھی۔''

Bill//Mesler_H.James Cleaves

(۱۰)(A Brief History of Creation. P.53)

آج کے دور کے دو علمی افراد Bill اور James نے بھی تخلیق کے موضوع پر
ایک کتاب لکھی ہے۔ بل ایک صحافی ہے جو واشنگٹن ڈی سی میں رہتا ہے جب کہ جیمس
International Society for the Study of the Origin of

Life کا صدر اور ٹوکیو کے Earth Life Science کا پروفیسر اور پرنسٹن میں
قائم Institute of Advanced Study کا وزیٹنگ پروفیسر ہے۔ جیمس کی
رہائش بھی واشنگٹن ڈی سی ہی میں ہے۔ تخلیق کے موضوع پر اس کی پیش کردہ مختصر
تاریخ آگاہ کرتی ہے کہ زندگی کس طرح وجود میں آئی تھی اور خدا کے بارے میں عموماً
اور تخلیق کے بارے میں خصوصاً دہریوں کے تصورات کس قدر گمراہ کن ہیں؟ کتاب
اصرار کرتی ہے کہ تخلیق ایک عملی حقیقت ہے۔ زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی تھی اور ارتقا اور
ڈارو ینیت کے ساتھ تخلیق کا کیا تعلق ہے؟ ڈی این اے کے Watson اور
Crick کے ماڈل سے بھی تخلیقی سائنس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ انتہائی تعجب کی بات
ہے کہ موجودہ دور کے سائنسدانوں کے پیش کردہ ان سارے حقائق کے باوجود
ڈاکسن کیسے خدا اور تخلیق کا انکار کرتا ہے؟

۸۔ مجھے یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی ہے کہ اس حقیقت کے باوجود
کہ دنیائے فطرت کے اسرار کو فاش کرنے میں سائنس کی قوتیں ناقابل چیلنج
ہیں، پھر بھی وہ خدا کے سوال کے حل کے بارے میں میری کوئی
مدد نہیں کرتیں۔ اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو اسے دنیائے فطرت سے کہیں باہر
ہی ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس حقیقت کے پیشِ نظر خدا کے بارے میں جاننے کی
راہ میں سائنسی ذرائع درست راستہ نہیں ہیں۔ Francis Collins-

The Language of God. P 30 (11)

فرانسس کولنس ایک نامور جینیاتی ماہر اور معروف Human Genome
Project کا طویل مدتی قائد ہے۔ ابتدا میں وہ مذہب کا منکر تھا جو بعد میں کٹر
دہریے پن میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی آف مشی گن میں طبی ماہر جینیات کی

حیثیت سے خدمات انجام دیتے ہوئے وہ کئی جینیاتی امراض مثلاً Hunington's Disease اور Cystic Fibrosis وغیرہ کے علاج کی دریافت میں مدد دیتا تھا۔ دہریت سے اقرارِ خدا تک کے سفر کی روداد اس نے اپنی ایک کتاب میں بیان کی ہے۔ کتاب بیسٹ سیلر بنی اور لوگوں کے لیے اس لحاظ سے خاصی دلچسپی کا باعث بنی کہ ایک سائنسدان خدا کی شہادت کا خود اقرار کرتا اور دہریت سے مذہب تک کے سفر کی روداد بیان کرتا ہے۔ مگر اس معاملے میں ڈاکسِن کی اپنی رائے کیا ہے؟ اس نے بھی تو اپنی کتاب میں کہانیاں بیان کی ہیں تو اس عظیم سائنسدان کی داستانِ حیات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟ کیا فرانس کولنس کے اس تبدیلی عقیدے نے اس کے خیالات کو ہلا نہیں دیا تھا؟

ایک اور اہم نکتہ جو کہ کولنس نے اپنے الفاظ میں اٹھایا ہے، جیسا کہ اوپر پیش کیا گیا، وہ خدا تک رسائی کے بارے میں اس کا ذہانت بھرا انداز ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا کے بارے میں واقفیت کے لیے موجودہ طریقہ کار درست نہیں ہے، کیوں کہ خدا ایک ماورائی ہستی ہے اور ماورائی ہستی کے بارے میں فطرتی طریقہ کار سے مدد لینا غیر عقلی ہے۔ لٰہذا اس کے بارے میں جاننے کے لیے ایک بالکل ممتاز طریقہ کار ہونا چاہیے جو ہمارے نزدیک کچھ اور نہیں بلکہ خدا کی نازل کردہ وحی ہی ہے۔ ہاں، تب جب کہ عقلِ سلیم کا استعمال کیا جائے۔ خدا کا وجود تب ہی جا کر سامنے آئے گا۔

۹۔ John Clover Monsma

انفرادی اقوال سے آگے بڑھ کر اجتماعی حوالوں (اقوال) کو اختیار کرتے ہوئے جوَن کلووَر نے ایک کتاب بنام Evidence of God in an Expanding

Universe مرتب کی جس میں اس نے وجودِ خدا پر جدید دور کے چالیس سائنسدانوں کی تحقیقات پیش کیں۔ کتاب نے اتنا مؤثر تاثر چھوڑا کہ دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ مثلاً انگریزی سے عربی اور اردو وغیرہ میں! پھر مزید مؤثر کرنے کی خاطر قول پر قول جمع کرتے ہوئے اس نے ان سائنسدانوں کے نام بھی ایک ساتھ دے دیئے جنھوں نے خدا کے اقرار پر دیئے ہیں۔

1. Frank Allen-Biophysist.
2. Robert Morris Page-Physicist.
3. Merrit Stanley Congdon-Natural Scientist.
4. John Cleveland Cothran-Mathematician and Chemist.
5. Donald Henry Porter-Mathematician and Physicist.
6. Edward Luther Kessel-Zoologist and Entomologist.
7. Walton Oscar Lundberg-Physiologist and Biochemist.
8. Paul Clarence Aebersold-Biophysicist.
9. Marlin Books Kreider-Physiologist.
10. George Earl Davis-Physicist.
11. Thomas David Parks-Research Chemist.
12. John William Klotz-Geneticist.
13. Oscar Leo Brauer-Physicist and Chemist.
14. Irving William Knobloch-Natural Scientist.
15. John Leo Abernethy-Research Chemist.
16. Russell Lowell Mixter-Zoologist.
17. Gerald T. Den Hartog-Research Agronomist.

18. Laurence Colton Walker-Research Forester and Plant Physiologist.
19. Walter Edward Lammerts-Geneticist.
20. Russell Charles Artist-Bilogist and Botonist.
21. George Herbert Blount-Applied Physicist.
22. Donald Robert Carr-Geochemist.
23. Peter W.Stoner-Mathematician and Astronmer.
24. Claude M. Hathaway-Consulting Engineer.
25. Merlin Grant Smith-Mathematician and Astronomer.
26. Edwin Fast-Physicist.
27. John Adolf Buehler-Consulting Chemist.
28. Albert McCombs Winchester-Biologist.
29. Olin Carroll Karkalits-Chemical Engineer.
30. Edmind Carl Kornfeld-Research Chemist.
31. Earl Chester Rex-Mathematician and Physicist.
32. Malcolm Duncan Winter Jr.-Medical Internist.
33. Dale Swartzendruber-Soil Physicist.
34. Laster John Zimmerman-Soil Scientist and Plant Physiologist.
35. Robert Horton Cameron-Mathematician.
36. Elmer W.Maurer-Research Chemist.
37. Wayne U.Ault-Geochemist.
38. Paul Ernest Adolp-Physician and Surgeon.
39. Cecil Boyce Hamann-Biologist.
40.Andrew Convey Ivy-Physiologist.

مذکورہ سائنسدانوں کی تفصیلات، ان کے کاموں کے مقامات اوران کی خدمات کے بارے میں اس کی کتاب The Evidence of God in an Expanding Universe میں سب کچھ پڑھا جاسکتا ہے۔ نیز اس میں ان کے مضامین بھی جمع ہیں۔(۱۲)

نوٹ کرنے کی خاص بات تو یہ ہے کہ تمام سائنسدانوں کا تعلق امریکہ سے ہے، وہ ملک جس کے سائنسدانوں کے گُن ڈاکِنس گاتا ہے۔ چناں چہ ان کے بارے میں وہ اب کیا رائے رکھے گا؟ کیا یہ لوگ بھی غیر تعلیم یافتہ، مذہبی جنون اور روایتی ہیں؟

۱۰۔ Dan Graves

ایک اور ممتاز کام Dan Groves نے بھی کیا ہے جس نے اپنی کتاب Scientists of Faith میں ماضی وحال کے ۴۸ سائنسدانوں کی سوانح حیات کو جمع کیا ہے۔ اس نے ان معروف سائنسدانوں کی زندگی سولہویں صدی سے شروع کر کے بیسویں صدی تک کی جمع کی ہے۔ گریوز کے مطابق یہ تمام کے تمام ۴۸ سائنسدان عیسائی عقیدے کے حامل تھے اور اس نے انہی کے تاریخی ثبوت اور اقوال کو پیش کیا ہے۔ آن لائن قارئین کے لیے یہ کتاب اس لنک پر موجود ہے۔(۷)

مندرجہ بالا اقوال، حوالہ جات اور نقول، ڈاکِنس کے پیش کردہ حوالہ جات اور نقول کے مقابلے میں صرف توازن پیدا کرنے کی خاطر دیے گئے ہیں، حالاں کہ ہمارے پیش کردہ اقوال اور نقول کہیں زیادہ عقلی اور ماورائے شکوک ہیں۔ قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ مندرجہ بالا عالمی سائنسدانوں میں ہم نے کسی ایک بھی مسلم سائنسدان کے نظریات کو دانستہ طور پر پیش نہیں کیا ہے کیوں کہ اسلامی سائنس اور علم پر ڈاکِنس کی

https://archive.org/details/scientistsoffaithoograv/mode.2up

مکمل گرفت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم نے نہیں اس لیے اترک کیا ہے کہ دلائل کچھ منصفانہ نظر آسکیں، لیکن ڈاکسن نے اس کے برعکس کیا کہ علم الانسان کے ماہر کی حیثیت کے باوجود ایسی باتوں تبصرہ کیا ہے جن پر اسے کافی معلومات بھی حاصل نہیں ہیں۔ البتہ ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ سائنس اور مذہب، دونوں کی روشنی میں کیا ہے۔ اس لیے بہتر تفہیم اور سوچ کی خاطر خدا کے بارے میں ہم نے بہر حال ایک مکمل سائنسی و مذہبی تصویر مہیا کی ہے۔ God Delusion میں جس کی شدید کمی ہے۔

تنقیدی جائزہ

۲۱. ۴۔ تمام تاثرات کو اکٹھا کرنا اور انکا تجزیہ کیا جانا

معلومات

ہمارا یقین ہے کہ ڈاکسن نے اپنی کتاب God Dulusion محض اس نقطہ نظر سے لکھی ہوگی کہ سچائی کی تلاش کی جائے۔ لیکن اگر اس کے برعکس اس نے یہ کتاب اس نیت سے لکھی تھی کہ کسی مخصوص عقیدے، مخصوص نظریئے کے حامی لوگوں کے خلاف نفرت دکھائی جائے اور ذاتی پسند و ناپسند کو فروغ دیا جائے تو اس میں وہ ناکام رہا ہے۔ اگر اس کے پیش نظر اولین نظریہ تھا کہ دانش مندانہ گفتگو رکھی جائے، تو تب ہی اس پر کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ورنہ نفرت کے جذبے پر تو کوئی رائے نہیں قائم کی جاسکتی (جو اس کتاب کے مواد ہی سے جھلکتا ہے)۔ تاہم اگر اس کے اولین مفروضے کو سامنے رکھا جائے تو ہم اسی کی خاطر تمام معلومات اکٹھا کررہے اور اپنا تبصرہ بھی پیش کررہے ہیں۔

۲۳. ۴۔ سماجی اخلاقیات

۱۔ اخلاقیات

سب سے اہم اور اولین طور پر اور حتمی نکتہ نظر پیش کرنے کی خاطر، جیسا کہ ایک متعین عنوان پر ڈاکسن نے محض سنی سنائی باتیں پیش کی ہیں۔ جاننا چاہیے کہ خدا پر بحث مباحثہ ہمیشہ ہی سے ایک پیچیدہ، حساس اور جذباتی معاملہ رہا ہے۔ دورِ ماضی ہی سے موضوع پر بات کرتے ہوئے فاضلین بہت محتاط رہے ہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لیتے رہے ہیں۔ لیکن ڈاکسن کا معاملہ دیگر ہے۔ موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ حدود سے نہ صرف باہر ہوا ہے بلکہ اشتعال انگیز بھی رہا ہے۔ جب کہ دلائل بھی اس کے بہت کمزور ہیں۔ یہ بات کہ بیشتر دہریئے اور لادین افراد اخلاق سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ آخر کیوں بہت معروف رہی ہے؟ وجہ یہی ہے کہ دہریت میں معروف سماجی انداز سے کسی کو حدود میں رکھنے کی خاطر کوئی بھی پیمانہ اور رہنما خطوط موجود نہیں ہیں۔ لادینی افراد چوں کہ آغاز ہی سے معاشرے کے خلاف باغی ہوتے ہیں، تو سماجی حدود کا لحاظ رکھنا بھی وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں اور نتیجے میں معاشرے میں ارتعاش و اخلاقی افراتفری کو جنم دیتے ہیں۔

پھر اس سوال پر بھی غور کرنا لازم ہے کہ مذہب آخر معاشرے میں امن، اخوت، مساوات اور اخلاقیات وغیرہ کو قائم کرنے میں کیوں کامیاب ہوجاتا ہے؟ اس لیے کہ ہر مذہب کی بنیادی تعلیم ہی اعلیٰ اخلاقیات کی ہیں اور اپنے ماننے والوں پر وہ زور دیتا ہے کہ وہ اچھے بنیں اور تاکیدی طور پر اخلاقی قدروں کی پیروی کریں۔ لہٰذا جوں جوں انسان زیادہ مذہبی ہوتا جاتا ہے، اسی لحاظ سے وہ اعلیٰ اخلاق یافتہ بھی ہوتا ہے۔ دہریت

میں چوں کہ ''سب سے طاقتور'' کا مقام ہوتا ہے۔ (Survival of the Fittest) اس لیے اخلاق کا کوئی پیمانہ وہاں نہیں پایا جاتا۔ ان کا نظریہ صرف یہی سکھاتا ہے کہ جو کچھ اپنے لحاظ سے تمہیں درست نظر آتا ہے وہ کام کر ڈالو۔ بغیر کام کی اخلاقی حیثیت کو جانچے! اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دہریت میں اخلاق کو کچل دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے میں انارکی کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات ان کے ذہنوں میں راسخ ہے کہ وہ ایک ''ترقی یافتہ جانور'' ہیں۔ اور جانوروں میں تو اخلاق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۰۔ علم الانسان کے دلائل

ڈاکسن نے چوں کہ کتاب کا بڑا حصہ علم البشریات کے دلائل پر مختص کیا ہے، خواہ غیر شعوری طور پر ہی سہی، بلکہ کتاب کے آخری تین باب تو اس کے علم البیان ہی پر مشتمل ہیں، لیکن اچنبھے کی بات یہ ہے کہ خدا سے انکار سب ہی ابواب کا اصل مدعا ہے۔ حالاں کہ معاشرے سے علم البشریات کا تعلق ہمیشہ ہی سے وابستہ رہا ہے۔ اس لیے ایک نئے دہریاتی نظریئے کو معاشرے میں نفوذ کے لیے لادینوں کو ایک نیا طرز عمل، علم البشریات متعارف کروانا پڑا۔ بلکہ ایک نئے قسم کا معاشرہ بھی! اس کے بعد ہی کہیں جا کر نئی لادینی تعریف کو رائج کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ایک مذہبی رنگ والے معاشرے میں ڈاکسن اور اس کے ہم نواؤں کی گونج قبول ہی نہیں کی جائے گی۔ ایک اور اضافہ میں یہ بھی کرنا چاہوں گا کہ معاشرے کے برے اور گندے افعال، مذہب سے تعلق ٹوٹنے کی وجہ ہی سے سامنے آتے ہیں۔ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، خیانت نہ کرو، بدعمل نہ بنو، بدکاری نہ کرو، اور کسی کی جان نہ لو، یہ تمام ہدایات مذہبی ہیں۔ اگر

ان میں سے کوئی بھی عمل ظہور پذیر ہوتا ہے تو فوراً ہی اس مذہبی فرد سے نفرت کی جانے لگتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مذہبی ہدایت کو توڑ دیا ہے۔ جب کہ دوسری جانب دہریت میں بدعنوانی، بدکلامی، اور بداخلاقی کو برائی جانا ہی نہیں جاتا کیوں کہ وہاں صرف کاروباریت راج کرتی ہے جس میں ذاتی منافع ہی دیکھنا ہوتا ہے۔ کسی لادین کے پاس چوں کہ ایسا کرنے کا جواز ہوتا ہے، اس لیے اس کے پاس برائی کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔ اگر اس کے عمل کو پسند کیا جاتا اور پھلنے پھولنے دیا جاتا ہو تو کوئی آخر نیک کیوں بنے اور کیسے بنے؟

مندرجہ ذیل اعداد و شمار کے ذریعے ہم غیر مذہبی لوگوں میں جرائم کی شرح کا ایک ریکارڈ پیش کر رہے ہیں۔ مذہب سے جان چھڑا کر ہم کس افراتفری کا شکار ہوتے ہیں۔ ذیل کے اعداد و شمار خود ہی سب کچھ بیان کر رہے ہیں۔

حملہ کرنے کی شرح	۴۶ فیصد	اوسط سے بھی زائد
قتل	۴۱ فیصد	اوسط سے بھی زائد
زنا	۲۶ فیصد	اوسط سے بھی زائد
مجموعی جرائم	۶۷ فیصد	اوسط سے بھی زائد (۸)

ذہن میں سوال گونجتا ہے کہ اگر ڈاکسن کو ریپ، قتل اور تشدد کے مجرموں سے دلچسپی ہے (یعنی وہ ان پر ترس کھاتا ہے۔ مترجم) تو دہریاتی معاشرے میں انہیں بہتر بنانے کا سوال کیوں نہیں اٹھاتا؟

مندرجہ بالا اعداد و شمار ثابت کر رہے ہیں کہ جس قدر بھی آپ مذہب سے دور ہوں گے، اسی قدر آپ کا ذہن بھی مجرمانہ ہوتا جائے گا اور جس قدر بھی آپ مذہب

8. https://www.nationmaster.com/country-info/groups/Non-religious-countries.crime

سے قریب ہوں گے، اسی قدر آپ کے ہاں شرح جرائم بھی کم ہوتی جائے گی۔سعودی عرب کی مثال سب کے سامنے ہے۔(حوالہ وکی پیڈیا) مذہبی لوگوں کے بعض جرائم (کالی بھیڑوں) کا ذکر کر کے ڈاکِسن آخر کیا ثابت کرنا چاہتا ہے؟ جب کہ ان میں ہزاروں مثالیں نیک لوگوں کی بھی پائی جاتی ہیں۔صرف معمولی مثالیں نہیں بلکہ اعلیٰ ترین مثالیں! ڈاکِسن نے اس طرح متاثر کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس میں وہ کامیاب تو کیا الٹا مورد عتاب ہی بنا ہے۔

۳۔دلائل آثار قدیمہ

سماجی علوم کے آخری حصے، ثقافت کو بھی یہاں زیر بحث لانا ضروری ہے، جسے ڈاکِسن نے (ممکنہ طور پر غیر دانستہ) اپنی کتاب میں چھوڑ دیا ہے۔آثار قدیمہ نام ہے دنیا بھر کے تہذیبی و ثقافتی مطالعے کا! لہٰذا اس موضوع سے متعلق اس کا مطالعہ بھی اسے کافی فوائد دے سکے گا۔انسان کے نشو ونما کے لیے تہذیبیں اور ان کا مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔کسی خاص نسل میں، کسی خاص عرصہ حیات میں، کیا رجحانات اور میلانات موجود تھے؟ اس مطالعے کو ٹیکسانومی Taxanomy اور ڈھانچہ جاتی مطالعہ کہا جاتا ہے۔Taxanomy ہمیں بالکل ہی آغاز کے بارے میں آگاہ کرتا ہے جب کہ ڈھانچوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حیاتیات کی ابتدا کا زمانہ کیا تھا؟ خصوصاً انسانوں کے بارے میں تو ضرور! فوسل ریکارڈ کے مطالعے ہی سے پتہ لگا ہے کہ پہلے والے انسان کیسے رہتے تھے؟ ان کی تہذیب و رواج کیا تھے؟ اور من الحیث المجموع معاشرے میں وہ کس طرح کی زندگی گذارتے تھے؟ ہماری گفتگو کا موضوع بھی اس وقت علم کی یہی شاخ ہے۔یعنی انسان کا مذہبی رنگ ڈھنگ! یہیں سے پھر دیگر اخلاقی قدروں اور نیکیوں کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔

زمانوں کی تبدیلی کے باوجود انسانی تہذیب پر مذہب نے اثرات ضرور مرتب کیے ہیں جن سے لوگوں میں استقامت اور بھلائیاں رواج پائی ہیں۔قدیم ماضی کے آثار، مصری، موہنجوداڑو اور ہڑپہ وغیرہ نے آگاہ کیا ہے کہ مذہب ان میں ایک غالب عنصر تھا حالاں کہ یہ تہذیبیں ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کی ہیں۔(ماخذ وکی پیڈیا) (۱۳) ان مطالعوں نے ثابت کیا کہ انسانی تہذیبیں دراصل مذہب اور ان پر عمل درآمد کی بنیاد پر ہی وجود میں آتی ہیں۔مذہبی عقائد نے جانوروں جیسی عادات والے انسانوں کو بھی مہذب انسانوں میں ڈھالا ہے۔لہٰذا مشاہدہ کرنے والوں کو لہٰذا ان قدیم تہذیبوں کا بھی لازمی مطالعہ کرنا چاہیے۔

دوسری جانب یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ لادینیت نے دنیا کو کیا دیا ہے؟ کیا اس نے کبھی تہذیب اور انسانیت کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا؟ کسی بھی تہذیب، خواہ وہ اصنام پرستی والی ہی کیوں نہ ہو۔انہوں نے اپنے معاشرے میں کچھ نہ کچھ اصول ضرور قائم کیے تھے، لیکن کیا دہریت نے کسی ایسی تہذیب کے جنم کا راستہ اختیار کیا ہے جہاں ایک معاشرتی بندھن ایسا موجود رہا ہو کہ لوگ اپنے مخصوص اقدار کے ساتھ زندگی گذارتے رہے ہوں؟ جواب بہت آسان ہے۔دہریت نے دنیا کے مہذب و منظم معاشرے میں اپنی جڑیں رکھی ہی نہیں ہیں، بلکہ آج کی دنیا میں بھی اس نے کوئی منظم روایت قائم نہیں کی ہے۔حالاں کہ بت پرستوں کے ہاں بھی بہت سی مذہبی رسومات مل جاتی ہیں۔اس سے یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ دہریت، معاشرے کا کبھی کوئی حصہ رہی ہی نہیں ہے۔نہ آج تک ایسا کر سکی ہے۔کیوں کہ سوائے خدا کے بحران اور اس کے ماننے والوں سے نفرت کے، اس نے لوگوں کو کچھ دیا ہی نہیں ہے۔قطع نظر اس کے کہ وہ کس مذہب کے ماننے والے ہیں۔ایک آڑھا ترچھا اور ٹیڑھا میڑھا اجتماعی ڈھانچہ

جس میں ہر ایک کو اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے کی اجازت ہو، عقل و دانش کے
لحاظ سے ہر ایک کو اس کی ہر مرضی کے مطابق خیال رکھنے کی آزادی ہو، یا ہر وہ کام اور
خیال کر گذرنے کی اجازت ہو جو اس کے ذہن میں آئے، تو ایسا ڈھانچہ سوائے
افراتفری اور ابتری پیدا کرنے کے اور کیا نتیجہ دے سکے گا؟ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے
کوئی شخص جنگل میں جائے اور یہ کہتے ہوئے اسے آگ لگا دے کہ مجھے ہر اس کام کو
کرنے کی آزادی ہے جو میرا ذہن خواہش کرے۔ اگر کوئی اس کے راستے میں مزاحم
نہ ہو اس کے ہاتھوں تو ہر شخص ہی کو مصیبتیں سہنی پڑیں گی اور اپنی خوراک، ایندھن اور
آکسیجن سب کچھ جلتا ہوا دیکھنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ صورت حال کا آپ خود اندازہ
کر سکتے ہیں۔ اس لیے سماجی و آثار قدیمہ کے دلائل سے ہمیں صاف معلوم ہوا کہ
دہریت اور دہریوں نے معاشرے میں کوئی منضبط لائحہ عمل فراہم نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ
غیر منظم لوگوں کا ایسا گروپ ہے جو معاشرے کو کوئی مفید اور ٹھوس پروگرام نہیں دیتا۔
یہ لوگ کسی کام کے بھی نہیں ہیں۔

۲۴.۴۔ حیاتیاتی اور طبعی سائنس

۲۵.۴۔ تجرباتی سائنس

۱۔ ارتقا

آج کے دور کا بنیادی ''عقیدہ'' ارتقا ہی ہے۔ اگر آپ خدا کا انکار کریں گے تو
آپ کو اس کے لیے کوئی متبادل دینا پڑے گا۔ اس مقصد کے لیے آج کے دہریوں
نے تصورِ ارتقا پیش کر دیا اور اپنا ''عقیدہ'' بنا لیا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ
ڈارون والے بھی اس کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں رکھتے۔ ہاں ارتقا کے

دلائل ضرور پائے جاتے ہیں، لیکن وہ ڈاروینی ارتقا والے نہیں ہیں، بلکہ وہ تو ڈاروینی
تعریف ارتقا پر بھی پورے نہیں اترتے۔ یہاں دونوں قسم کے ارتقا میں ہمیں واضح فرق
نظر آتا ہے۔ حیاتیاتی ارتقا اور چیز ہے اور ڈاروینی ارتقا کچھ اور! چناں چہ اس بارے
میں ہمیں ان پر ترجیح حاصل ہے۔ ترجیحی طرز عمل یہ ہے کہ اس مسئلے سے نبرد آزمائی کے
لیے فرق کرنے والا کوئی نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ تب ہی جا کر مذہبی یا دہریاتی بیانیہ اور
تصویر ابھر کے سامنے آتی ہے کہ یہ سائنس، بایالوجی، جینیات یا سائنس کی کوئی قسم
ہے۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو یہ تجرباتی سائنس ہے نہ کہ الٰہی بیانیہ یا کوئی دانشور فلسفہ۔
جس طرح سائنس سے ناواقف کسی فرد کے لیے، اس کے اصولوں اور مختلف
شاخوں پر تبصرہ کرنا نامناسب بات ہے، اسی طرح کسی غیر روحانی فرد کے لیے
روحانیت اور اس سے متعلق علوم پر تبصرہ کرنا بھی نامناسب بات ہے۔ یہ کوئی راکٹ
سائنس جیسی بات نہیں ہے، بلکہ سادہ و عام فہم بات ہے!

۲۔ خلائی/کائناتی حقائق

لادینی گروہ کا ایک بڑا سہارا کائناتی دلیلیں ہیں۔ آیئے تو اس مرحلے پر کچھ تجزیہ ان
کا بھی ہو جائے۔ ان کے دعوے کے مطابق ایک عظیم دھماکہ ہوا تھا جس سے عظیم
کائنات (از خود) وجود میں آ گئی تھی! سوال یہ ہے کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس دھماکے
کے پیچھے خدا کا ہاتھ نہیں تھا؟ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہوگی اگر وہ اس سوال کا جواب نہ دے
سکیں۔ اس بڑے دھماکے کے وقت وہ کہاں موجود تھے؟ بلکہ کوئی بھی موجود نہیں تھا،
کیوں کہ انسانی زندگی تب وہاں پائی ہی کہاں جاتی تھی؟ اس لیے یہ لوگ وثوق سے یہ
دعویٰ کیسے کرتے ہیں کہ دھماکہ خدا کی جانب سے نہیں ہوا تھا اور ہر چیز اپنے آپ ہی سے

وجود میں آ گئی تھی؟ (یہ تو ایسا سوال ہے جسے پیش کرتے ہوئے بھی ہمیں عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔لیکن کیا کریں کہ مجبوری ہے)۔ یہ کہ قوانین فطرت موجود ہیں، مان لیا اور یہ کہ انہی کی قوت سے کائنات عمدہ اور گرفت کے انداز میں کام کر رہی ہے، یہ بھی مان لیا۔لیکن ان قوانین (فزیکل، بایولوجیکل یا کچھ اور) کے نفاذ کے پیچھے خدا موجود نہیں ہے اس پر آخر کوئی پر کیسے اتفاق کرے؟ اگر ان سائنسی اور فلسفیانہ مراحل پر تبصرہ کرنا اتنا آسان ہوتا تب تو ہر چلتا پھرتا فرد بھی ایک سائنسدان یا فلسفی ہوتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ جدید طریقے یا فیشن سے راستہ نکالا گیا ہے تو خدا کبھی فیشن سے باہر بھی نہیں ہوا۔ مذہب تو مارکیٹ کا سب سے گرم مال ہے۔ جدید فیشن کی ایک مثال یہ ہے کہ لادینی لوگ اپنی روٹی اور مکھن محض مذہب پر تنقید اور اس سے نفرت کے فلسفے کے تحت حاصل کرتے ہیں۔ یہ مثال ہے اس کی کہ مذہب زندگی کے ہر شعبے، سماجی، خاندانی، اخلاقیات اور سیاست میں موجود پایا جاتا رہا ہے اور اہم ترین و دلچسپ ترین حقیقت یہ ہے کہ اپنے ماننے والوں اور انکار کرنے والوں دونوں ہی کو وہ یکساں طور پر رزق فراہم کر رہا ہے۔

۳۔ جینیٹک جینیالوجی

ڈی این اے، انسانی جینس اور اس کی نسلوں کے مطالعے کے دوران یہ دو نمایاں الفاظ ''جنیٹک جینالوجی'' ایک دوسرے سے بہت مربوط رہتے ہیں۔ تمام انسانی جڑیں ایک مخصوص علاقے، نسل، گروہ اور رنگ کی طرف ہی جاتی ہیں۔ دوسری جانب ڈی این اے اور کروموسومز انسانی خصوصیات کے کردار کے بارے میں آگاہی دیتے ہیں جو انسانوں کے اندر بالکل ابتدا ہی سے موجود ہیں۔ صاف حقیقت یہ ہے کہ انسانی نسلوں کی جینیات، کسی بھی لحاظ سے نہ تو کسی دوسرے جاندار سے ملتی

ہیں نہ ان سب کا کوئی واحد اَبّ وجَد (باپ دادا) ہے اور نہ یہ اَبّ وجد اب کہیں زندہ موجود ہیں کہ کچھ ثبوت ان سے بھی لے لیے جائیں۔ جو کچھ بھی بیان کیا جاتا ہے، محض قیاس آرائی اور حاشیہ آرائی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر قسم کے جاندار بشمول انسان، ایک مشترکہ علاقہ ضرور رکھتے تھے، لیکن ان میں کبھی کوئی نسلی یا لسانی اشتراک موجود نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی اہم ہے کہ کسی اور جاندار یا نسل کا ڈی این اے اور کروموسوم وہ کبھی نہیں رہے جو انسانوں کے ہیں۔ یعنی کروموسومز کے ۲۳ جوڑے، مجموعی طور پر ۴۶۔ مشکل یہ ہے کہ ان تمام سائنسی حقائق کے باوجود ان کے دعوے جاری ہیں کہ عضویاتی ساخت کی بنا پر سب کی جینس یکساں ہے۔ لیکن انسانی ساخت اور ڈھانچے کے لحاظ سے کوئی بھی جاندار اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ بالکل امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ تو مثالی انسانی جڑواں بچوں کو دیکھ لیں۔

۲۶.۴۔ اخلاقیات کے علم میں ڈاکِسن کہاں کھڑا ہے؟

خدا کی تلاش اور اس کے بارے میں جاننے کی خاطر سب سے پہلے تاریخی اور جدید علوم، اخلاقی اصول اور ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ ڈاکِسن کی کتاب کے مطالعے کے بعد ابھرنے والا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا کتاب لکھتے وقت اس نے ان ساری باتوں کا خیال رکھا تھا؟ یا اسے معاشرے کی کچھ کالی بھیڑوں (گندے لوگوں) موضوع سے غیر متعلق چند اقوال، اور کچھ مصدقہ نظریات Theories کو منتخب کر کے اپنے نکتہ نظر کو ثابت کرنا ہی مقصود تھا؟ اس معاملے میں اس نے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کی کہ معاشرے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے جو بہت گہری عقیدت کے ساتھ خدا پر ایمان رکھتا ہے؟ حد تو یہ ہے کہ ڈاکِسن اس معاملے میں یہاں

تک بڑھ گیا ہے کہ کتاب کا نام ہی اس نے ”خدا کا دھوکہ“ God Delusion رکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہمت والی بات ہے۔ اس لحاظ سے اخلاقیات میں ڈاکِسن کا مقام کیا بنے گا؟ الٹے سیدھے دلائل دے کر اور خدا کے بارے میں ایسا لفظ استعمال کر کے اس نے خود اخلاقیات کے خلاف کام کیا ہے۔

۲۔ God Dolusion کا علمی مقام

اس کتاب کے بارے میں ہم کوئی درجہ بندی تو نہیں کر رہے، لیکن ادبی لحاظ سے ضرور اس پر کچھ رائے زنی کر سکتے ہیں۔ علمی بحث میں کسی خاص موضوع کے مثبت اور منفی دونوں قسم کے دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے۔ افسانوی دنیا میں تو اس کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن غیر افسانوی (حقیقی) دنیا میں یہ ایک لازمی وصف ہے۔ ہم نے کتاب میں دیکھا کہ ڈاکِسن نے اس میں اپنے کچھ بیرونی ذاتی مشاہدات، تجربات اور موصول شدہ خبروں کا سہارا لیا ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ علمی مباحث میں کیا ذاتی تجربات کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے؟ دلائل میں قوت آتی ہے یا محض صفحات بھرنے کے کام آتے ہیں؟ مزید برآں اپنے ہی جیسے ہم خیال لوگوں کے غیر متعلقہ اقوال نقل کرنے سے کام کی اثر انگیزی تو ویسے ہی محدود ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں ہمیں اپنی نفرت اور تعجب پیشگی ظاہر کرنے کے بجائے غیر جانب دارانہ اور دانش مندانہ فرد بننا چاہیے۔ اگر آپ لوگوں میں نفرت پھیلائیں گے، یا ان سے جھوٹے سچے وعدے کریں گے تو اس سے کوئی علمی فائدہ آپ کو حاصل ہونے سے تو رہا۔

۳۔ مصنف ڈاکِسن کو الٰہیات کی طرف دعوت

میرا بنیادی سوال ڈاکِسن سے یہی ہے کہ کیا آپ کو الٰہیات کا مطالعہ کرنے کا

بھی کبھی اتفاق ہوا ہے؟ اور کیا آپ نے کبھی قرآن پاک کو بھی پڑھنے کی زحمت کی ہے؟ اگر نہیں تو بسم اللہ کیجیے اور اس میں بھی غور و فکر کیجیے! کیوں نہ آپ اپنے شکوک و شبہات کے بارے میں کسی مذہبی ماہر سے معلومات لیتے اور ان کی صحبت حاصل کرتے تا کہ اندازہ ہوتا کہ ان کے جوابات آپ کو کہاں لے جا رہے ہیں؟ دیر اب بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے ابتدا کی جا سکتی ہے۔

اصل ضرورت درست نیت سے دیکھنے کی ہے۔ اگر آپ نے مذہبیات کو گہرائی کے ساتھ نہیں پڑھا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ پھر آپ نے اس کی مخالفت کیسے کر لی؟ کس قدر فاش غلطی ہے کہ آپ وہی کچھ اپنے حق میں پیش کریں جو آپ کے دماغ میں سما رہے ہیں اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر رہیں کہ عالمی معاشرے پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اُن نتائج اور تاثرات سے قطع نظر جو اس کتاب سے حاصل ہوں گے۔ ہم اس کتاب کو بہترین بنانے کی خاطر اس کے مندرجہ جات پر اب بھی دوبارہ غور کر سکتے ہیں۔ مقصد یہ کہ لوگ اسے پڑھ کر ایک حقیقی علم حاصل کر سکیں نہ یہ کہ ہر قیمت پر اپنی ہی بات منوا کے رہیں۔ اس لیے ڈاکِسن کے لیے یہ بہت عمدہ قدم ہے۔ اگر وہ مذہب کو اس کی بالکل ابتدا ہی سے جاننا شروع کر دے۔

۲. ۴۔ درمیانی راستہ

کسی مسئلے کا ایک مشترک حل حاصل کرنے کی خاطر ایک بہتر، عمومی و قابل اتفاق سوچ لازمی ہے۔ چناں چہ اس معاملے میں بھی کہ دہریوں اور مذہبیوں کے درمیان تنازع حل ہو جائے، خلوص کے ساتھ عمومی اتفاق رائے والی سوچ پیدا کرنی ناگزیر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مشترکہ عمومی سوچ کیا ہو؟ اس بارے میں قرآن

پاک ہماری مدد کرآتا ہے۔ کہتا ہے ”اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔“ (۳:۶۴)(۴)

قرآن کی یہ آیت دراصل غیر مسلموں سے خطاب ہے تا کہ انہیں ایک متفقہ نکتے پر جمع کرے اور مسلم و غیر مسلم کے درمیان (۱) یکساں چیزوں پر اتفاق پیدا ہو اور (۲) متنازعہ امور سے نظر اندازی اختیار کی جائے۔ یہ ایک اعلیٰ اصول ہے، کیوں کہ متنازعہ امور کا فیصلہ تو بعد میں بھی کرلیں گے، لیکن کم از کم مشترک مسئلے پر تو ہم سب کا اتفاق ہو ہی جانا چاہیے، پھر ہم خود دیکھ لیں گے کہ بڑی پریشانی کے بغیر باقی مسئلے بھی از خود حل ہو چکے ہیں۔

۲۸. ۴۔ ہماری طلب صرف درست طریقہ کار ہے

اور یہ اتفاق رائے بھی تب ہی حاصل ہوگا جب اس کے لیے طریقہ کار بھی درست اختیار کیا جائے۔ زیر مطالعہ کتاب میں میں نے ہر مقام پر یہی سوال اٹھایا ہے۔ اگر ہم ایک بڑھئی ہیں اور سنار بننے کی کوشش کریں، یا ایک لوہار ہیں اور ہیرا نکالنے کی کوشش کریں، تو ایسی صورت میں کسی مشترک نکتے تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ماہر حیاتیات Biologist ہو اور وہ یکا یک خدا اور مذہب پر لیکچر دینا شروع کردے تو وہ یا تو ایک کمتر درجے کا کام کرے گا یا غیر متعلقہ دلائل دے گا۔ سوچ لہٰذا بالکل یکساں اور ہم سر ہی ہونی چاہیے۔

تو اب ہمارے معاملے میں مشترک نکتہ کیا ہے؟ خدا کو ماننے اور نہ ماننے والوں کے مشترکات کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ہم نے ایک ہشت پہلو راستہ نکالا ہے، جو یہ ہے۔

۳۹. ۴۔ ہشت پہلو راستہ

۱۔ درست راستہ اختیار کرنا
۲۔ عقل و دانش کا استعمال کرنا
۳۔ مسئلے کے حل کے لیے انتہائی سنجیدگی اپنانا
۴۔ ہر قابل ثبوت سائنس کی مدد کا حصول
۵۔ غیر جانبدارانہ انداز
۶۔ ہر نامعقول بات سے نجات
۷۔ صحیح نتیجے تک رسائی
۸۔ جو کچھ نتیجہ نکلے، قبولیت

میرا خیال ہے کہ اس ایجنڈے کو دونوں ہی فریق درست پائیں گے، کیوں کہ عقل مند فرد اسی طرح کے پیمانے پیش کرے گا۔ آیئے اب انہی اصولوں کی بنیاد پر ہم خدا کے معاملے پر بھی غور کریں۔

۱۔ درست راستہ اختیار کرنا

اس موضوع پر اولین اہمیت درست راستہ اختیار کرنے کی ہے۔ اگر ابتدا ہی میں درست سمت اختیار نہ کی گئی تو نتیجے کا درست نکلنا بھی ممکن نہ ہوگا، بلکہ ممکن ہے کہ کوئی غلط نتیجہ ہی برآمد ہو جائے خدا کے معاملے پر...... آیئے، پہلے سائنسی طریقے کے اطلاق کا سوچیں۔ چوں کہ خدا کو دیکھا اور چھوا نہیں جا سکتا، اس لیے تحقیق کی ابتدا ہم سائنسی طریقے سے کر ہی نہیں سکتے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جسے دیکھا نہ جا سکے اس کا وجود ہی نہ ہو، کیوں کہ خیالات، احساسات اور ایٹم کے ذرات کو کوئی بھی نہیں دیکھ پاتا، تو پھر ایٹمی ذرات کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کی

موجودگی کو ان کی واضح خصوصیات ہی سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی درست راستہ ہے۔ لہٰذا خدا کو بھی اس کی واضح صفات ہی سے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کی محسوس کی جانے والی خصوصیات کیا ہیں؟ واحد جواب ''تخلیق'' ہے! اللہ کو آپ اس کے افق، شمس، قمر، نجوم اور گیس کے غبار سے پہچانیں اور اللہ کو آپ خلیوں کی گہرائی، اس میں موجود زندگی، اور زندگی کے ڈھانچوں سے شناخت کریں۔ ان میں آپ کو بے شمار خدائی حقائق مل جائیں گے۔ سوال صرف اس کے مشاہدے اور تفکر کا ہے۔

۲۔ عقل و دانش کا استعمال

درست سمت اختیار کرنے کے بعد آپ کا کام مجموعی طور پر عقل کے دائروں کے اندر ہی رہنا ہے، مگر عقل کے دائرے کیا ہوتے ہیں؟ اس کا مطلب ہے ثبوتوں کو جمع کرنا اور قیاس آرائیوں کو ترک کرنا۔ جب آپ تخلیق کے مرحلے پر غور کرنے لگیں کہ nebula کہاں سے آیا یا زندگی کیسے وجود میں آئی؟ تو آپ کو احساس ہونے لگے گا کہ یہ سب کچھ ایک ذہین، مافوق الفطرت، تمام طاقت ور اور تخلیق کا عمل کروانے والی ہستی ہی کا کام ہے۔ اب آپ سمجھ جائیں کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، بالکل عقل و دانش سے پُر ہے۔

۳۔ مسئلے کے حل کے لیے انتہائی سنجیدگی اپنانا

اگر کوئی فرد عمل تخلیق کے سحر انگیز حقائق دیکھ کر اصرار کرنے لگے کہ مسئلے کے حل کے لیے وہ بالکل سنجیدہ ہے، تو یہ سب کے لیے حیرت کی بات ہونی چاہیے۔ حل تلاش کرنے کے لیے سنجیدگی اور ایمانداری بنیادی شرط ہے، ورنہ وہ سدا جانبداری اور غیر سنجیدگی کا اظہار کرتی رہے گی۔

۴۔ غیر جانبدارانہ انداز

ایک محقق کے لیے ناگزیر ہے کہ مسئلے کے انجام تک پہنچنے کے لیے غیر جانبدارانہ انداز اپنائے۔ اگر ہم خدا کی جستجو کر رہے ہیں، مگر ذہن پہلے ہی یہ بنا ہو کہ خدا نہیں ہے اور پھر موضوع کی چند نفرتیں بھی اس میں سمو لیں، تو سوچا جا سکتا ہے کہ سچائی تک کیسے پہنچا جا سکے گا؟ بدقسمتی سے ڈاکنس نے خدا کے خلاف صرف تعجب اور نفرت کا جذبہ ہی سموئے رکھا ہے جس کا اظہار وہ ٹی وی شوز اور زیرِ نظر کتاب میں کرتا رہا ہے۔ اگر خدا کے بارے آپ ابتدا ہی سے کوئی فیصلہ لیے بیٹھے ہیں تو درست نتیجے تک پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔

۵۔ ہر قابل ثبوت سائنسی مدد کا حصول

اوپر کی شق میں قابل ثبوت کا لفظ اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کی تلاش کے سلسلے میں ہر ایسے سائنسی عمل سے گریز کرنا چاہیے جسے تجرباتی طور پر ثابت نہ کیا جا سکے۔ بصورت دیگر وہ نہ صرف تمام کام کی صحت اور سند کا سوال اٹھے گا بلکہ مزید کئی متنازعہ سوال بھی جنم لیں گے۔ اس لیے نظریات کو چھوڑ کر محض سائنسی حقائق ہی کی مدد لینی چاہیے۔ ڈارون کے مفروضات کی مانند یہ گویا ''اپنی رقم کو غلط طور پر جیب میں ڈالنا ہے۔'' اس سے دونوں فریقوں میں ایک جمود کی کیفیت پیدا ہوگی۔ نمبر بنانے کے جنون میں ہر قسم کے تصورات اور مفروضات کی مدد لینا ایک کارِ عبث ہے۔

۶۔ ہر نامعقول بات سے نجات

نامعقول باتوں سے دور رہنے کا کیا مطلب ہے؟ یہ کہ آپ ہر غیر ثابت شدہ چیز، خصوصاً غیر سائنسی چیز سے طاقت حاصل کرنے سے رک جائیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے

کہ نظریات اور تصورات اسی نامعقول مواد کو بنیاد بنا کر کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اگر مثلاً یہ کہا جائے کہ چوں کہ مارکیٹ میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا بہت مقبول ہے، اس لیے یقینی طور پر خدا کا کوئی وجود نہیں ہے، تو پھر یہ ایک قطعی غیر منطقی اور لایعنی بات ہوگی۔ چلیں سوچیں کہ ڈارون سے پہلے کیا معاملہ تھا؟ یہ لوگ مہذب تھے اور کسی نہ کسی مافوق الفطرت ہستی (خدا) پر اعتقاد رکھتے تھے۔ چلیں فرض کریں کہ ان میں بھی چند سر پھرے دہریئے قسم کے لوگ تھے، تو اس وقت وہ اپنی دہریت کی کیا دلیل دیتے ہوں گے؟ (کیوں کہ ڈارون تو مارکیٹ میں تھا ہی نہیں؟ مترجم) دوسری طرف ان لوگوں کے دلائل کیا ہوتے ہوں گے جو مذہب پر یقین رکھتے تھے؟ قدرتی بات ہے کہ آج کے مذہبی لوگ اپنے باپ داداؤں سے بھی زیادہ مضبوط ہیں، کیوں کہ اب ان کی پشت پر بھی سائنس موجود ہے۔ صرف سائنس ہی نہیں، فلسفے اور مذہب کی قدیم تاریخ بھی! اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مدلل و دانشمند ہونے کے لیے سائنس، فلسفے اور تاریخ کا بھی شکر گذار ہونا چاہیے۔

۷۔ صحیح نتیجے تک پہنچنا

ہر قسم کی چھان پھٹک اور مشقت والی جد و جہد، مسئلے کا دراصل درست حل نکالنے کی خاطر ہی کی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے خبر ہو کہ ہم کسی صحیح نتیجے تک پہنچے ہیں۔ اگر چہ ایسا دعویٰ کرنا آسان نہیں ہے، لیکن بہر حال مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر تمام مراحل دلچسپی اور درست طریقے سے طے کیے گئے ہوں تو درست نتیجے تک پہنچنے کے امکانات بڑھ ہی جاتے ہیں۔ خلاصے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ درست نتیجہ وہ ہوتا ہے جو شکوک و شبہات، جانبداری، تعصب اور حقائق کی چشم پوشی سے پاک ہو۔

فرض کریں کہ ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مریخ پر زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے۔ تو اس کے ثبوت کے لیے ہمیں سب سے پہلے صحیح طریقہ کار اپنانے کی ضرورت ہی پیش آئے گی۔

اس کے بعد ناسا کے مریخ تک خلائی مشنز کی تفصیلات جاننی ہوں گی اور پھر حاصل شدہ مواد کی مدد سے عقلی بنیاد پر نتیجے تک پہنچنا ہوگا۔ زیادہ تر لوگ اپنی شہرت کی خاطر بغیر علم اور بغیر سچائی، فوراً نتیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ غیر جانب دار ہونے سے یہاں ہماری مراد NASA کے خلاف کسی بغض یا جھکاؤ کا نہ ہونا ہے۔ یعنی پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ اس شخص کو ناسا سے یا تو بہت محبت ہے یا سخت شکایت ہے۔ اس کے بعد ٹیلی اسکوپ، ہَبل ٹیلی اسکوپ اور ناسا کے غیر انسانی مشنز کا مطالعہ کیا جائے۔ جب یہ مرحلہ عبور ہو جائے تو مفروضے اور غیر سائنسی دلائل سے صرف نظر کر کے صرف اسی مواد پر بھروسہ کیا جائے جو مستند ہو۔ تب ہی جا کر آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ شک و شبہے کے بغیر کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں کہ آیا مریخ پر زندگی پائی جاتی ہے یا نہیں؟

لہٰذا خاص معاملے میں بھی ہمیں یہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہمارا اصل موضوع خدا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں بنیادی مواد تو الہامی کتابوں ہی سے حاصل ہوگا۔ ہاں اگر آپ کو محسوس ہو کہ ان میں بھی بعض باتیں حقائق کے خلاف ہیں، تو آپ انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو انہیں فوراً قبول کر لیں۔ آیئے اس ضمن میں ہم قرآن پاک کو ایک آزمائشی کیس کے طور پر لیں۔ اگر بہت سارے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس میں ایک چھوٹی سی بھی غلطی یا معمولی سا بھی غیر عقلی مواد نہیں پایا جاتا تو آپ کا کام ہے کہ اس دعوے کی خود پڑتال کریں۔ پھر آپ کی عقل

بھی اگر اس کی گواہی دے دے تو قبول کرنے میں کوئی جھجک بھی محسوس نہ کریں۔ ۱۴ صدیوں سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے، مگر یہ ہو بہو بالکل ابتدائی نسخے جیسا ہی ہے! بس اسے قبول کر لیں! یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے خدا کو جاننے کے بارے میں آپ نے پہلا قدم رکھ دیا ہو۔

۸۔ نتیجہ جو کچھ بھی نکلے قبول کرنا

آپ کی تمام جدوجہد اور مرحلے بیکار جائیں گے اگر آپ نے ان نتائج کو خوش دلی سے قبول نہیں کیا۔ یہ ایک بہت اہم نکتہ ہے۔ غیر جانبداری تقاضا کرتی ہے کہ ثابت اور تجربہ شدہ حقائق کو خوش دلی سے قبول کریں، خواہ آپ کے پیشگی خیالات سے وہ کتنا ہی ٹکراتے ہوں! ہمارے معاملے (خدا کے بارے میں بھی) آپ کو ایک مکمل غیر جانبدارانہ سوچ اور غیر جانبدارانہ طریقہ کار ہی اختیار کرنا ہوگا۔ اگر ہم نے یہ پالیا ہے کہ (اس کائنات کا ایک) خدا بھی ہے اور وہی ہے جو تمام نظم و نسق سنبھالے ہوئے ہے۔ اور ہماری تمام تر تحقیق کا حاصل بھی یہی ہے، تو اس کے بعد ہم ان حقائق کا انکار کیسے کر سکتے ہیں؟ محض اس وجہ سے کہ یہ ہمارے ذاتی تصورات کے برعکس نکلے ہیں؟ یہ تو ایک قسم کا علمی زہر ہے۔ اگر آپ مندرجہ بالا حقائق تسلیم نہیں کرتے تو اس کا صاف مطلب آپ کا جانبدار ہونا ہے۔

حاصلِ تحقیق

زیر مطالعہ کتاب Philosophical and Scientific Analysis of Richard Dawkin's God Delusion. میں پیش کی گئی تحقیق

تجویز، کتاب کے مکمل مطالعے، مختلف تحقیقی طریقہ ہائے کار کی پیروی، تمام دستیاب مواد کے حصول، اور ان تنقیدی جائزے کے بعد میرا حاصل مطالعہ حسب ذیل ہے۔

ا۔ یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ہر انسانی نسل میں خدا پر اعتقاد ہمیشہ ایک نہ علیحدہ کیا جانے والا عقیدہ رہا ہے۔ یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ اولین و بنیادی سوچ، نسل انسانی میں خدا کے بارے ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ نیز حیاتیاتی اور جینیاتی لحاظ سے بھی انسان کی سرشت میں خدا شناسی ازخود پیوستہ رہی ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ہر مذہب، خصوصاً سامی مذاہب میں، خدا ایک بنیادی حقیقت رکھتا ہے اور اس کی بنیادی تعلیمات خدا کے گرد ہی گھومتی ہیں۔

۲۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ رچرڈ ڈاکسن کی کتاب God Delusion میں دو قسم کے پہلو اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک فلسفیانہ اور دوسرا سائنسی۔ لہٰذا جب ہم نے دونوں قسموں کے نقطہ ہائے نظر کے درمیان بنیادی فرق نکالا تو دیکھا کہ تمام دسوں ابواب میں سائنسی اور فلسفیانی تضادات اور خامیاں موجود ہیں۔

۳۔ یہ حقیقت بھی واشگاف ہوئی کہ تصورِ ارتقا اپنے آغازِ تصور ہی سے متنازعہ ہے، مگر رچرڈ ڈاکسن Richard Dawkins نے اسی کو بنیادی نظریہ بنالیا، لیکن تائید یا مخالفت میں کوئی بھی تحقیقی مواد پیش نہیں کیا۔ محسوس کیا گیا ہے کہ Charles Darwin کے تصورِ ارتقا، اس سطح کی شہادتوں سے بہت دور ہے، جن کی بنیاد پر اس سے کوئی سائنسی یا نظریاتی بنیاد اٹھائی جائے۔ یہ بھی نوٹ کیا گیا ہے کہ ڈارونی ارتقا کے حق میں کوئی براہ راست شہادت موجود نہیں ہے اور نہ ہی ڈارون نے ایسی کوئی کوشش کی ہے۔

۴۔ یہ بات بھی واضح ہوئی کہ فلاسفروں اور مفکروں کے درمیان خدا اور خدا پر

دلائل کے لحاظ سے ایک یکساں ومفید مباحثہ ہمیشہ ہی جاری رہا ہے۔ وجود خدا پر فلسفیانہ اور سائنسی دونوں لحاظ سے نتائج نکالے جاتے رہے ہیں؟ جب کہ وجودِ خدا دونوں جانب ہی ایک مضبوط معاملہ رہا ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا گیا کہ روحانیت اور دہریت دونوں ہی معاملے میں عقائد، عقلی کہے جاتے ہیں۔ تاہم دہریت کے معاملے میں اختیار کیا جانے والا اندازِ فکر جانبدارانہ اور عقلی گمراہی کا ہے۔ مذہبی معاملے میں دلائل اس لیے مضبوط رہے ہیں کہ انہوں نے ان کی بنیاد مقدس کتب اور تخلیقی ذاتی مشاہدات پر رکھی ہے۔ مزید یہ کہ وجودِ خدا پر مختلف سائنسدانوں اور مفکروں کے خیالات کو بھی پرکھا گیا اور نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عام و تعلیم یافتہ افراد دونوں ہی قسم کے معاشروں میں یہ عقیدہ گویا دل کے نہاں خانوں تک میں گُندھا ہوا ہے۔

۵۔ خدا کے دیکھے کو ایک حقیقت کے طور پر لیا گیا ہے

۳۰.۴۔ خلاصہ

خلاصے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ رچرڈ ڈاکنس کی محنت، God Delusion براہ راست اور واقعاتی شہادتوں سے خالی ہے اور ثبوت کی خاطر اس میں محض اتفاقات ہی کو اختیار کیا گیا ہے۔ مصنف کا زیادہ تر زور سائنس اور فلسفے پر رہا ہے۔ تاہم جدید یونانی فلسفے اور جدید سائنسی لحاظ سے اس کے نظریات حقائق سے بہت دور ہیں۔

خلاصے کے طور پر کہنا چاہیے کہ ''خدا ایک واہمہ نہیں بلکہ حتمی سچائی ہے۔''

ضمیمہ ۱: ''پلٹ ڈاؤن میں'' نظریہ ارتقاء اور اس کی حقیقت

برطانوی مفکر چارلس رابرٹ ڈارون (۱۸۸۲۔۱۸۰۹) جو ایک ڈاکٹر باپ کا بیٹا اور خود ایک بایالوجسٹ تھا، اور جس کا خاندان شہر میں خوشحال گردانا جاتا تھا، اپنے دور میں اس نے نظریہ ارتقاء پر ایک کتاب بنام On the Origin of Species تحریر کی تھی جس میں تحقیقات سے ثابت کیا تھا کہ ہر جاندار نے درجہ بدرجہ ترقی کر کے ہی اپنی موجودہ اصلی شکل حاصل کی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ مثلاً زرافہ نے اپنی موجودہ گردن اونچی اونچی شاخوں سے غذا حاصل کرنے کے لئے ہی رفتہ رفتہ لمبی کی تھی۔ چنانچہ انسان نے بھی اپنی موجودہ انسانی شکل درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے ہی حاصل کی ہے۔ اس کے نزدیک بندر (چیمپینزی) نے پہلے پہل اپنے اگلے دونوں پاؤں اوپر اٹھائے تھے، جھکی ہوئی حالت میں زندگی گذارنے کے قابل ہوا تھا، اور پھر رفتہ رفتہ اس کے جسم کے گھنے بال کم ہونے شروع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہی سے کہیں جا کر اس میں عقل کی نشوونما ہونی شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ قطعی حتمیت کے ساتھ ڈارون نے قرار دیا کہ انسان کے آباء و اجداد اپنی اصل میں بندر تھے۔ زور دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ انسان پہلے ''انسان نما بندر''، پھر ''بندر نما انسان''، اور آخر کار ''مکمل انسان'' بن سکا تھا۔

ڈارون کے اس انکشاف نے سائنس دانوں کی ایک بڑی تعداد پر گویا سکتہ سا طاری کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی بہرحال انجیل ہی کا مطالعہ کرتے آئے تھے۔ لیکن اس نظریے کے بعد تو انہیں انجیل کا بیان بے بنیاد لگنے لگا۔ سائنسی نظریہ ان پر حاوی ہو گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ آج کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ایک یہودی ربی ''بنجامن بلیخ''، بھی اسی نظریئے کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب میں وہ سوال کرتا ہے کہ ''ہمیں

تورات کی جانب دیکھنا چاہئے کہ وہ اس ضمن میں ہمیں کیا سکھاتی ہے؟۔ وہ کہتی ہے کہ موجودہ دنیا، اپنی تکمیلی حالت میں ترقی کرتے ہوئے ہی آج کے دور تک پہنچ سکی ہے۔ بنجامن ربی سمجھاتا ہے کہ تورات بیان کرتی ہے کہ ''خدا نے جب تخلیقِ کائنات کا منصوبہ بنایا تھا تو سب سے پہلے دن اس نے 'دن' کو جنم دیا تھا۔ پھر دوسرے دن اس نے 'آسمان' کی پیدائش کی تھی۔ تیسرے دن 'اس نے 'خشک زمین' کو جنم دیا تھا۔ چوتھے دن سورج اور چاند تاروں کی تخلیق، پانچویں دن 'مچھلیوں اور پانی' کی تخلیق، اور آخری اور چھٹے دن 'چوپایوں اور انسانوں' کی تخلیق کی تھی''۔ اس کے بعد وہ سوال کرتا ہے کہ پھر اگر انسان بھی اسی طرح بندر کی شکل وصورت اور عادات واطوار سے تبدیل ہوتے ہوتے موجودہ اصل انسانی حالت میں سامنے آیا ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟ (کتاب Jewish History and Culture امریکہ، ص ۳۹۔ ۳۸)۔ اتفاق دیکھئے کہ کمیونزم کا بانی کارل مارکس بھی ڈارون کی اس کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ربی کا یہ بیان بہر حال ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں کرتا کہ یہودی مذہبی زعماء بھی ڈارون کے نظریے سے متفق نظر آتے ہیں۔ پھر یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مفاد پرست حضرات جھوٹ اور فاسد امور کی خاطر دلائل بھی آخر کہاں سے لے کر آتے ہیں!؟۔ یعنی اس معاملے میں وہ مقدس کتابوں تک کو بھی نہیں بخشتے!

ایک طویل مدت تک ڈارون کے اس نظرئے کی تشہیر ہوتی رہی۔ اس پر ایمان رکھنا تب گویا زمانے کے فیشن ہی میں داخل ہو گیا تھا۔ اس دور کے دانشور اور علماء و فضلاء، ڈارون کی عجیب تحقیق پر جیسے جھوم جھوم کے رہ گئے تھے!۔ اپنی اصل الٰہی

تخلیق، حضرت آدم وحوا کی نسل ہونے کو چھوڑ کر انہوں نے خود کو بآسانی بن مانسوں کی اولاد قرار دے لیا تھا۔ اگرچہ اس نظریئے کی رد میں آج خود مغرب سے بے شمار کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس کے ایک دو پہلوؤں کا ہم خود بھی جائزہ لے لیں۔

کہا گیا تھا کہ انسان بننے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے اس نے پہلے اپنے اگلے دونوں پاؤں اٹھائے تھے اور جھک کر چلنا شروع کیا تھا۔ (اس قسم کی مفروضہ تصاویر انسائیکلو پیڈیا میں بھی کافی پیش کی گئی ہیں)۔ تاہم عقل اس دلیل کو تسلیم کرنے کو اَبا کرتی ہے۔ اسے پہلی فرصت میں رد کرتی ہے۔ انسان کچھ عرصے کے لئے تو جھک کر چل سکتا ہے لیکن اس صورت میں خود کو مسلسل برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ایسا کرنا اس کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ حیوانات بے فکر ہو کر، اور آرام سے، یا تو چاروں ہاتھ پاؤں کی مدد سے چل سکتے ہیں یا پھر محض دو پیروں کی مدد سے!۔ لیکن یہ کہ ان کے پیر تو چار ہوں لیکن چلیں وہ کسی قدر جھک کر محض دو پیروں کی مدد سے، تو یہ عمل حیوانات (انسانوں اور جانوروں) دونوں کے لیے ممکن نہیں ہے!۔ مذکورہ نظریئے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارتقاء کی منزل میں زرافوں نے اپنی گردن اونچے درختوں سے غذا حاصل کرنے کے لئے ہی موجودہ شکل میں تبدیل کی تھی۔ حالانکہ یہ حقیقت تو کیا، محض ایک واہمہ ہے۔ خود سائنسدانوں نے بھی بہت تحقیق کے بعد آگاہ کیا ہے کہ اب سے چار پانچ ہزار سال پہلے کے زرافے کے جو ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں، ان میں بھی ان کی گردن آج ہی کی مانند لمبی پائی گئی ہے۔

تاہم جوں جوں علم اور وقت آگے بڑھتے گئے، ڈارون کے نظریات مسلسل سوالات کی زد میں آنے لگے اور کئی زاویوں سے اس کے انکشافات شکوک وشبہات کی

نذر ہونے لگے۔ حیرت انگیز طور پر بعد کی لگاتار سائنسی تحقیق سے صورتحال ایک بالکل نئے انداز سے سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ حقائق وہ نہیں ہیں جو فاضل ماہر حیوانیات ڈارون نے پیش کیے تھے، بلکہ کچھ اور ہیں۔ بعد کے سائنس دانوں نے بتایا کہ ڈارون نے اپنے یہ نظریات کسی بھی لحاظ سے ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں کئے ہیں۔ بات کی وضاحت کی خاطر انہوں نے دلائل بھی کافی فراہم کئے اور مضامین و مقالات کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ بھی شروع کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انسان اپنی ابتدا میں بھی آج ہی کی طرح کا ایک مکمل انسان تھا جس کا بندروں کی نسل چیمپینزی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

لیکن حقائق کی روشنی میں لائے جانے کے باوجود مذکورہ بالا گمراہ کن نظریہ آج بھی حسبِ سابق بھی شدومد کے ساتھ پھیلا و بڑھایا جا رہا ہے۔ نئی وجدید تحقیقات اپنی جگہ، لیکن ڈارون کا نظریہء ارتقا اپنی جگہ!۔ آخر ایسا کیوں ہے؟۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ دہریئے نظریات کے حامل دانشوران، دنیا کے لوگوں کو ان کے تخلیق کنندہ خدا سے بالکل کاٹ کے رکھ دینا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں چاہتے کہ مذہب اور خدا کا دنیا میں کہیں بھی ملاپ ہو۔ اسی سلسلے کو یہ لوگ ''الّیو میناتی نظام'' (روشنی کا نظام) قرار دیتے ہیں۔ الیو میناتی دانشوران قرار دیتے ہیں کہ دنیا میں محض ان کے جنم شدہ شیطانی نظام ہی کو بالا دستی ہوگی اور اسی کا سکہ یہاں رائج ہو کر رہے گا۔ اگرچہ اسے وہ ''روشنی کا نظام'' قرار دیتے ہیں لیکن اپنی اصل میں وہ ''اندھیرے اور شیطانیت کا نظام'' ہے۔

چنانچہ یہ انہی کے تربیت یافتہ مادہ پرست ذرائع ابلاغ، اور روحانیت سے جان چھڑانے والے باغی سائنس دان ہیں جن کی تاریک کتابیں روشنی کے اس دور میں بھی مسلسل سامنے آتی جا رہی ہیں۔ عالمی ذرائع ابلاغ بھی انہی کی مانند اس نظریئے کو

فروغ دینے میں پیش پیش ہیں کیونکہ ان کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ حقائق سے زیادہ وہ افسانوں اور سنسنی خیزیوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہی ان کے روزگار کی شاہ کلید ہے۔ چنانچہ انسانی ارتقاء کے مختلف درجوں کی فرضی تصویریں دنیا بھر میں پھیلا دینے والے لوگ اور ادارے بھی یہی ہیں۔ انہی مفکرین نے کمپیوٹرس کی چالبازیوں کی مدد سے مردوں اور عورتوں (انسانوں) کو مکمل برہنہ حالت میں جسم پر گھنے بال رکھے ہوئے دکھایا ہے (تاکہ بن مانس نما کوئی چیز لگیں)، اور تعلیمی نصاب میں شامل کروایا ہے۔ بلکہ حیرت انگیز طور پر وہ ان کے جسموں پر پتے بھی نہیں دکھاتے جن کا وہ تعلیمی اسباق میں بہت چرچا کرتے ہیں۔ حالانکہ بندر نما انسان یا انسان نما بندر اگر کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہو بھی گیا تھا اور اس کا دماغ بھی کم از کم کسی درجہ ''ترقی'' کر چکا تھا تو اپنے پوشیدہ حصوں کو تو اسے فوراً ہی ڈھانپنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی کیونکہ تھوڑی سی شرم وحیا تو اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے اندر بھی رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مرغی سب کے سامنے کبھی انڈے نہیں دیتی اور کتے اپنی دموں کو عموماً گرا کر ہی رکھتے ہیں۔

آج کی ترقی یافتہ خواتین بھی چوبیس گھنٹے اور تین سو پینسٹھ دن بغیر لباس کے زندگی نہیں گذار سکتیں۔ کیونکہ مرد ہو یا عورت، انسان اپنی شرم وحیا کے ہاتھوں بالکل مجبور ہے دوسری جانب موسموں کے بھی اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں!۔ حقیقت یہ ہے کہ الیو میناتی لوگوں کو اس ضمن کے حیوانات کی ایک تصویر بھی اصلی نہیں مل سکی ہے!۔ اسی لئے یہ ماہرین محض فرضی تصویروں سے دل بہلاتے اور سائنسی حقائق کے پہلو بہ پہلو جعلی و مسترد شدہ نظریات کو گردش میں رکھتے ہیں۔

پروپیگنڈا اصل میں ایک بہت طاقتور ہتھیار ہے۔ صحیح یا غلط، دونوں نظریات کو

بلا جبر دنیا بھر کی سات ارب کی آبادی سے اگر از خود منوانے کا کسی کا ارادہ ہو تو کتب، رسائل، اور دیگر ذرائع ابلاغ، اس کی اس آرزو کو چند سالوں ہی میں بآسانی پورا کر دیتے ہیں۔ جبکہ ان کا ذب نظریات کا رد اور اصل حقائق سے لوگوں کی باخبری، مذکورہ ذرائع کی مدد کے بغیر تقریباً ناممکن ہی بنا دی جاتی ہے!۔ اس گفتگو کے بعد ہم اب اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

پلٹ ڈاؤن مین

ڈارون کے نظریے کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد ہی اس کے خیالات کو بہ لطف و کمال آگے بڑھانے والے دین بیزار سائنسدانوں نے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے بہت بعد میں ایک ایسا درمیانی انسان ''دریافت'' لیا جو بقول ان کے تین چار سو سالوں کے بعد بس مکمل انسان کی شکل میں ڈھلنے ہی والا تھا۔

یہ ۱۹۱۲ کی بات ہے جب انگلینڈ میں اسی کے تقریباً ہم نام ایک اور سائنسدان ''چارلس ڈاسن'' Charles Dawson نے ایک برطانوی گاؤں Piltdown میں حیوانی سر کا ڈھانچہ پایا۔ ڈھانچے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے سر کا ڈھانچہ اور جبڑے کی ہڈی چمپینزی کی، اور دانت انسانوں کے تھے۔ چنانچہ اسے دیکھ کر پھر تو حتمی طور پر طے ہی کر دیا گیا کہ ڈارون کی جانب سے پیش کیا جانے والا ''نظریہء ارتقاء'' اپنی اصل میں بالکل درست ہے، اور یہ انسان اس کا عملی، عقلی و ناقابل تردید ثبوت ہے۔ ڈھانچہ چونکہ ''پلٹ ڈاؤن'' نامی علاقے برطانیہ سے ملا تھا، اس لئے ڈھانچے کو Piltdown Man کر پکارا جانے لگا۔ اس دریافت پر سائنسدان اس درجے خوش ہوئے کہ ایک بار پھر مقالہ در مقالہ جات لکھے جانے لگے اور نصاب میں بھی

شامل کیا گیا۔ کہا گیا کہ انسانی و حیوانی یہ ڈھانچہ کم از کم بھی پانچ لاکھ سال پرانا اور کسی یورپی فرد کا ہے۔ بعض اخبارات نے ''حسبِ دستور'' اسے کسی عورت کا ڈھانچہ گردانا کہ ایسا کرنا ہر دور کا ایک ناگزیر حرفہ ٹھہرتا ہے!۔ اپنے کارنامے پر یہ حضرات اس درجے پُرمسرت تھے کہ اس پر کچھ نہیں تب بھی کم از کم پانچ سو مقالے ضرور لکھے گئے اور چالیس سالوں تک تمام تر اہمیت دی جاتی رہی۔ حد یہ ہے کہ آج کل کے ''ایچ جی ویلز'' اور ''برٹرینڈ رسل'' جیسے معروف دانشور حضرات بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی کتابوں بالترتیب The Outline of History اور A History of Western Philosophy میں اسے انسان کی جدید علمی فتوحات میں شمار کیا۔

تاہم دھوکے بازی زیادہ دیر تک اپنا بھرم کب قائم رکھ سکتی ہے؟۔ کیونکہ دھوکہ بہر حال دھوکہ ہوتا ہے اور حقائق بہر حال اپنا آپ منوا کر رہتے ہیں۔ چنانچہ چالیس سالوں کے بعد ۱۹۵۲ میں جا کر کہیں پتا لگا کہ اس ڈھانچے کی تمام تر کہانی بے بنیاد ہے اور یہ کوئی سائنسی تحقیق نہیں ہے۔ (کولیئرز انسائی کلوپیڈیا۔ امریکہ۔ جلد ۱۲)

برطانوی عجائب گھر کے ایک نگراں Kennith Okley نے ۱۹۴۹ء میں جب اس پر کچھ طبی و سائنسی تحقیقات کیں تو پتہ لگا کہ اس کے بارے میں جو کچھ کہا اور لکھا گیا ہے، وہ تو کسی لحاظ سے درست ثابت نہیں ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے آگاہ کیا کہ دراصل کسی فرد نے چمپینزی کے بڑے بڑے دانتوں کو گھس کر انسانوں جیسا چھوٹا کر دیا اور ڈھانچے کو ایک خاص رنگ سے رنگ دیا تا کہ اس طرح ایک نئی شکل ''انسان نما بندر'' کی سامنے آ سکے۔

اس نئے انکشاف نے تو سائنس کی دنیا میں ایک بار پھر قدیم جیسی ہلچل مچا دی۔

کس کو پتہ تھا کہ عظیم سائنس دان 'ڈارون' کا نظریہ یوں تار تار ہو کے رہ جائے گا۔

بہر حال بہت چھان پھٹک کے بعد آخر کار واضح طور پر اعلان کیا گیا کہ ''دریافت شدہ ڈھانچہ سائنسی لحاظ سے تاریخ کا سب سے بڑا دھوکہ ہے!'' (الفاظ قابل غور ہیں)۔ جدید ماہرین نے واضح کیا کہ مذکورہ ''شکل وصورت'' میں بعض جعلسازیاں کی گئی تھیں اور ڈھانچے کو انسان کی شکل میں ڈھالنے کی دانستہ کوشش کی گئی تھی۔ نیز یہ کہ چیمپانزی کا جبڑا وغیرہ بھی ''لاکھوں'' سال پہلے کا نہیں بلکہ محض ''حالیہ'' مرے ہوئے کسی بندر کا ہے۔ انکشاف کے نتیجے سے جو ہلچل مچی اس کے بعد سے پلٹ ڈاؤن کا وہ ڈھانچہ برطانوی عجائب گھر سے فوری طور پر ہٹا دیا گیا جہاں چالیس سالوں سے وہ دنیا کی ''معلومات'' میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا!۔

ڈارون اور اس کے قبیل کے دیگر مفکرین کے یہ نظریات علمی وسائنسی فضا میں آج سے سو سالوں تک محض اس لئے چھائے رہے کہ اس دور تک جدید سفری آسانیاں، نازک ترین تحقیقاتی آلات، خوردبین و دوربین، تشخیصی سہولتیں، سائنسی علوم، اور غور و فکر کی صلاحیتیں وغیرہ، ہمہ معیاری اور با اعتماد حد تک سامنے نہیں آسکی تھیں۔ لیکن جوں جوں سائنس آگے بڑھتی رہی اور علم اپنا دامن وسیع تر کرتا رہا، ڈارون کے نظریات پیہم شکوک وشبہات کی زد میں آتے چلے گئے۔

حقائق اور تہہ تک پہنچنے والے علم کی آج کی یہ دنیا، نہ تو چارلس ڈارون کے نظریہء ارتقاء کو درست مانتی ہے اور نہ چارلس ڈاسن کے خود ساختہ ''پلٹ ڈاؤن مین'' کو کوئی اہمیت دینے کو تیار ہے!۔ کل کا دھوم مچا دینے والا ''پلٹ ڈاؤن مین'' آج کا محض افسانہ بن کر رہ گیا ہے! (مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ کریں گوگل سرچ ''پلٹ ڈاؤنم مین'')

ڈارون کی حالاتِ زندگی لکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اپنے آخری دور میں وہ اس عقیدے کا قائل ہو گیا تھا کہ ''خدا تمام قوانین کا ماخذ نہیں ہے''۔

تازہ ترین خبر کے مطابق ایتھوپیا میں چند انسانی باقیات ملی ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ انسانی باقیات لاکھوں سال پرانی ہوسکتی ہیں۔ اس سے پہلے ۱۹۷۴ میں یہاں سے ایک زنانہ فوسل 'ملا تھا جسے امریکی شہر کلیولینڈ کے محققین نے ''لوسی'' کا نام دیا تھا اور بندر کی شکل سے ملتی جلتی اس فوسل کو ایک عرصے تک انسانوں کی ماں قرار دیا گیا تھا۔ تاہم اب وہی محققین کہہ رہے ہیں کہ لوسی اور حالیہ دریافت شدہ ان باقیات میں بھی کوئی مماثلت نہیں ہے۔ (جنگ کراچی۔ ۲۰۱۵۔۵۔۲۹)

مطلب یہ ہے کہ موجودہ دور کی انسانی باقیات اور اُس دور کی ''لوسی'' میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اسے غلط طور پر انسانوں کی ماں قرار دیا گیا تھا۔ انسائی کلوپیڈیاز بتاتے ہیں کہ سائنسدان اسی قسم کی مضحکہ خیز حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ انسان کسی بھی لحاظ سے بن مانسوں کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے۔

۱۔ ہارون یحییٰ کتاب Tell Me About the Creation-- New Delhi

۲۔ انسائی کلوپیڈیا۔ کولیئرز۔ امریکہ

۳۔ انٹرنیٹ۔ وکی پیڈیا سرچ

۴۔ Jewish History and Culture USA Publishers Alpha

۵۔ عظمتِ قرآن۔ مولانا وحیدالدین خان۔ بھارت دارالتذکیر لاہور

ضمیمہ ۲۔ پہلا انسان۔ بن مانس یا خلیفہ ءخدا؟

رضی الدین سید۔ کراچی

مغربی دنیا میں انیسویں صدی ہی سے طلبہ کو سکھایا اور پڑھایا جارہا ہے کہ دنیا کا پہلا انسان، انسان نہیں، بندر تھا۔ کچے گوشت کھاتا تھا، پتھر کو رگڑ کر آگ پیدا کرتا تھا، غاروں اور کھوؤں میں رہتا تھا، اور پتوں اور کھالوں سے جسم کو ڈھانکتا تھا وغیرہ۔ گویا ہرگز بھی وہ ایک مہذب انسان نہیں تھا۔ بن مانس کی مانند وہ ایک جنگلی حیوان تھا۔ اس نظریئے کو سب سے پہلے چارلس ڈارون نے علمی دنیا میں متعارف کروایا۔ اس وقت تک مغربی دنیا چونکہ یکسر بے خدا ہو چکی تھی، اس لئے کلیسا کو تڑپانے کی خاطر عوام میں بھی اس نظرئے کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ جبکہ حضرت آدم کی شرف انسانیت پاؤں تلے روندی جانے لگی۔ ہر انسان اسی خیال میں مست و مگن ہوا کہ اس کے آباؤ اجداد (مدتوں پہلے) بن مانس ہوا کرتے تھے۔

تاہم عقل و دانش کے لحاظ سے یہ بات ہرگز بھی قابل قبول نہیں بنتی۔ یعنی یہ کہ کیا وہ اعلیٰ و نفیس ترین انسان جو جنت جیسی پر لطف و معطر ترین مقام میں رہائش رکھتا تھا، جسے فرشتے سلام کرتے تھے، جس کے لئے تمام نعمتیں خود پیش کی جاتی تھیں، اور جسے اعلیٰ ترین پوشاک مہیا کی جاتی تھی، اسی ہستی کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جب زمین پر اپنا پہلا پیغمبر اور خلیفہ بنا کر اتارا گیا تو لاوارث و مصیبتوں کا مارا بنا کر اتارا گیا؟ کہا گیا کہ تم اب وہاں مرو یا جیو، تمہارے پیدا کرنے والے کا تم سے اب کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کچا کھاؤ، پکا کھاؤ، غاروں میں رہو، پتوں سے جسموں کو ڈھانکو، اور سردی بھگتو یا گرمی، یہ مسئلہ ہمارا ہے ہی نہیں۔ اس ضمن میں ایک اور پہلو بھی قابلِ

غور ہے۔ قرانِ پاک نے ہمیں بتایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب تبلیغ کرتے تھے تو وہاں کے سردار اور متکبرین اپنے چہروں کے گرد کپڑے لپیٹ لیتے تھے تاکہ شناخت نہ کئے جاسکیں۔ (دیکھیں سورۂ نوح) اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس دور تک (یعنی حضرت ابراہیمؑ کے دور سے بھی ہزاروں سال پہلے کپڑا موجود تھا) تو کیسے ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی پہلے کپڑا موجود نہ ہو؟

نہیں بھولنا چاہئے کہ فرشتوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے جب اپنا منصوبہ رکھا تھا تو انہوں نے انسان کی جھگڑے و فساد کی خصوصیت کے باعث ہی اس عمل کے خلاف رائے دی تھی جبکہ شیطان بھی اسی باعث انہیں سجدہ کرنے سے منکر ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تو واشگاف طور پر اعلان کر ہی دیا تھا کہ وہ زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت سے آخر کار کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کو زمین پر اترنا ہی تھا۔ یہیں سے پھر اس واہمے کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو ان کے گناہ کی وجہ سے سزا کے طور پر زمین میں اتارا تھا۔ جبکہ اس نے توبہ کے الفاظ سکھا کر دونوںؑ کو اسی وقت معاف بھی کر دیا تھا۔ سو کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ غفور الرحیم، پھر بھی انہیں سزا دے؟ اور زمین میں بھیج دے؟ سزا کا یہ شوشہ تورات کا تو ہوسکتا ہے، قرآن کا نہیں۔

نہیں بھولنا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی وجہ، تورات میں بھی یہی بتائی گئی ہے۔ اور یہودیوں کی مذہبی کتاب تورات، عیسائیوں کی بھی مقدس کتاب ہے۔ کتاب بتاتی ہے کہ ”ایسی صورت میں اللہ نے زمین سے مٹی لیا اور انسانی شکل بنایا۔ اور ناک میں زندگی کی سانس پھونک دی۔ تب انسان ایک ذی روح بن گیا“ (پیدائش۔ ۲:۷)۔ پھر عقل سے یہ بات بھی بالاتر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام (پہلے انسان) سے قبل، جبکہ کوئی دوسرا انسان دنیا میں تھا ہی نہیں، تو پھر جنگل کے بن مانس سے انسان

کیوں کر ''ایجاد'' ہوگیا؟۔ سب کہانیاں ہیں اور سب قصے ہیں! اسے ایک کلیہ سمجھنا چاہئے کہ قومیں جب مذہبی تعلیمات سے جان چھڑالیں تو ان کا نتیجہ شدید ترین گمراہی کی شکل ہی میں سامنے آتا ہے۔

قرآن نے اس دور کے جو حقائق بیان کیے ہیں، ان میں کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے یہ دعا کی تھی کہ اے میرے رب جو من لوگ، مرد وعورت جو جو عذاب کے دوران میرے گھر میں پناہ لیں، اور دیگر تمام مومنین کو بھی بخش دے۔ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس دور میں نہ صرف حضرت نوح علیہ السلام بلکہ تمام دوسرے لوگوں کے بھی گھر ہوا کرتے تھے۔ بلکہ حضرت نوح علیہ السلام کا گھر تو شاید زیادہ ہی کشادہ ہوگا۔ کیونکہ وہاں بچ جانے والے تمام افراد پناہ لے کر رہائش پذیر تھے۔ نیز عاد وثمود کے محلات تھے۔ نیز عاد وثمود کے قصے بھی قران پاک نے بیان کیے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں عام سادہ مکانات تو کیا، محل نما مکانات بھی پائے جاتے تھے۔ یہ تمام نشانیاں اپنے ااپنے مقامات پر آج بھی موجود ڈارون ودیگر لادین مفکروں کے نظریات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جبکہ ڈارون نے اپنے تمام خیالات کو محض مفروضوں ہی پر استوار کیا ہے۔ کوئی عملی ثبوت وہ سانے نہیں لا سکا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اور ان کا دور آج سے لگ بھگ ۶۰۰۰ سال قدیم ہے۔ تو اس وقت تک بھی انسانوں نے بہت ترقی کر لی تھی۔